

پاکستان

ایک نظریہ - ایک حقیقت

پاکستان

ایک نظریہ، ایک حقیقت

ناشر

ہلال پبلیکیشنز، ہلال روڈ، راولپنڈی کینٹ

اشاعت : 2018ء

کتاب : پاکستان۔ایک نظریہ،ایک حقیقت

ISBN نمبر: ISBN-978-969-7-------

تالیف وترتیب: شعبۂ تعلقاتِ عامہ افواجِ پاکستان، بلال روڈ راولپنڈی

فون: 051-9271617,051-9274345

0314-5174982

ای میل: publications@hilal.gov.pk

قیمت : 500روپے

مطبع : خورشید پرنٹرز، اسلام آباد

فہرست

انتساب

تحریک پاکستان کے ان تمام قائدین اور کارکنان
کے نام جن کی جدوجہد مسلسل اور بیش بہا قربانیوں سے
مسلمانانِ برصغیر کو ایک علیحدہ وطن حاصل ہوا اور
جن کی منزل کا سفر جاری ہے۔

پیش لفظ

دو قومی نظریہ وہ واحد رہنما اصول ہے جس کو بنیاد بنا کر مسلمانان برصغیر نے ایک الگ وطن کیلئے جد و جہد کی اور اپنے جذبے اور قربانیوں سے اپنے خوابوں کی عملی تعبیر پاکستان کی صورت میں حاصل کی۔ اس کی آزادی کے لیے مسلمانوں نے ایک طویل اور صبر آزما جنگ لڑی۔ تحریکِ پاکستان اور پھر تعمیر ملت کے دوران پیش آنے والی مشکلات اور نا مساعد حالات کا جس طرح انہوں نے مقابلہ کیا اور پھر سرخرو ہوئے، وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن اور ولولہ انگیز باب ہے اور یقیناً ہمارے لئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے بزرگوں اور ان کے کارناموں پر بجا طور پر فخر ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناحؒ، علامہ محمد اقبالؒ، لیاقت علی خانؒ اور تحریک پاکستان کے دیگر قائدین اور پھر تعمیر پاکستان اور استحکام پاکستان کے تمام ہیرو ہمارا سرمایہ افتخار ہیں۔ پاکستان کی آزادی، ترقی، خوشحالی اور استحکام کے لئے ان کی مسلسل کوششیں اور قربانیاں آئندہ نسلوں سے بھی اُسی محنت، جد و جہد اور حبُ الوطنی کا تقاضا کرتی ہیں۔ اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ اپنی تاریخ اور بزرگوں کی قربانیوں کو یاد رکھا جائے۔ ہمیں اپنے حال و مستقبل کے خد و خال وضع کرتے ہوئے تحریکِ پاکستان کے قائدین اور ان کی دور اندیشی کو ہمیشہ ملحوظِ خاطر رکھنا ہوگا۔ پاکستان محض ایک زمین کے ٹکڑے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک نظریے کا بھی اظہار ہے۔ یہ نظریہ اِسلام کے عالمگیر اصولوں پر مبنی ہے جس کے بنیادی خد و خال میں عدل و انصاف، تقویٰ، رواداری، بنی نوع انسان کی توقیر اور فلاح و بہبود، عورتوں کے حقوق، اقلیتوں کا تحفظ، غرضیکہ ایک مثالی اسلامی فلاحی ریاست کا قیام ہے۔ ہم سب کو من الحیث القوم اس سمت بڑھنا ہوگا اور اس

سفر میں نوجوان نسل ہمارا ہراول دستہ ہے۔ یقیناً ہمارے نوجوان باصلاحیت ہونے کے ساتھ محب وطن بھی ہیں۔ پاکستانی قوم اور افواجِ پاکستان نے ہمیشہ قائدِاعظمؒ کے خیالات و افکار کی روشنی میں مشکل حالات کا ہمت و حوصلے سے مقابلہ کیا ہے۔ آئے روز قوم کے بیٹے اپنی جانیں قربان کر کے قائدؒ کے پاکستان کو مضبوط اور ناقابلِ تسخیر بنانے کے عزم کا ثبوت دیتے ہیں۔ آج الحمدللہ یہ قوم ہر طرح کی اندرونی اور بیرونی جارحیت کا منہ توڑ جواب دینے کی استعداد سے مالامال ہے۔

افواجِ پاکستان کا میگزین 'ہلال' تحریکِ پاکستان اور قائدین کے اعلیٰ اوصاف و افکار کو ہمیشہ اجاگر کرنے میں پیش پیش رہا ہے۔ اس کتاب میں اُن تحریروں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ جن کا مقصد نئی نسل کی تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔ نوجوان نسل کسی بھی قوم کا گراں قدر سرمایہ ہوتے ہیں۔ یقیناً ماضی کے پسِ منظر میں لکھی گئی یہ تحریریں ان کی تربیت اور آگاہی کا باعث ہوں گی تاکہ وہ ان کی روشنی میں مستقبل کے چیلنجز سے بہتر طور پر عہدہ برا ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پاکستان استحکام کی منازل پر گامزن ہے اور ہمیشہ قائم رہے گا۔

میجر جنرل آصف غفور
ڈائریکٹر جنرل
انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
جنرل ہیڈکوارٹرز، راولپنڈی

قیامِ پاکستان کا پہلا قدم

محمد امین زبیری

...•••...

انیسویں صدی کے آخری عشرے سے بیسویں صدی کے وسط تک جتنی بھی شخصیات نے برِعظیم کے مسلمانوں کی قیادت کی، ان میں سے ایک قابل ذکر تعداد ان لوگوں کی ہے جو علی گڑھ تحریک کے زینے سے اس مقام پر پہنچے۔ "علی گڑھ مدرسہ مسلم ہند کا اسلحہ خانہ تھا اور اس کے طلباء اس کے بے خوف سپاہی تھے۔" گورنر جنرل پاکستان غلام محمد نے 7 جنوری 1954ء کو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ تحریک پاکستان کا ابتدائی سہرا تحریک علی گڑھ سے ملتا ہے۔ اس تحریک نے سرسید احمد خان کی قیادت میں برصغیر کے مسلمانوں کو شکست خوردہ ذہنیت اور بے عقلی سے نجات دلائی جو جنگ آزادی 1857ء کی ناکامی کے بعد ان پر طاری تھی۔

بابائے اردو مولوی ڈاکٹر عبدالحق جو عہدِ سرسید کے ہی ممتاز علمی و ادبی شخصیت تھے اور سرسیّد سے قریبی تعلق رکھتے تھے، اپنے مضمون میں لکھتے ہیں: "برصغیر میں سرسید احمد کی تحریکِ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کا باعث ہوئی اور اس کے نتیجہ میں جو زبردست، سیاسی، معاشی اور معاشرتی بیداری پیدا ہوئی وہ قیام پاکستان کی بنیاد تھی۔ سرسید اپنی زندگی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ چھوڑ گئے ہیں جو ہمارے لئے صحیفۂ ہدایت ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں میں بڑے بڑے مجاہد، ذی علم وفضل، پاک نفس بزرگ اور مصلح گزرے ہیں، ان کا دائرہ عمل محدود تھا لیکن سرسید کا میدانِ عمل قومی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی تھا۔ ایسا جامع الصفات مصلح مسلمانانِ برصغیر کو اس سے پہلے نصیب نہ ہوا۔ سرسیّد نے ایک مایوس اور افسردہ قوم میں نئی روح پُھونکی اور ایسا قومی جذبہ بیدار کیا جو اب تک کام کر رہا ہے۔ سرسید کا دل قوم کی دردمندی سے لبریز تھا۔ عمر بھر اسی دُھن میں

مصروف کار رہے اور آخری دم تک مردانہ وار بلکہ دیوانہ وار کام کرتے کرتے 1898ء میں اس دنیا سے چل بسے۔"

سرسید احمد خان 17 اکتوبر 1817ء کو دہلی میں پیدا ہوئے ان کے آباواجدا داموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں عرب سے ہجرت کر کے ایران و ہرات میں آباد ہوئے ۔ پھر عہد شاہ جہانی میں ہندوستان آ گئے اور بہت جلد دربار میں اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔ عالمگیر ثانی نے سرسید کے دادا سید ہادی کو جواد علی خان کا خطاب اور منصب ہزاری عطا کیا۔ان کے فرزند میر متقی کا دربار و قلعہ سے تعلق رہا۔انہوں نے اپنے فرزند سید احمد خان کی تربیت اسلامی اور اخلاقی اصولوں پر کی۔کتابی تعلیم کا وقت آیا تو بسم اللہ کی تقریب ہوئی ۔حضرت شاہ غلام علی نقشبندی نے جو ایک عارف باللہ بزرگ تھے، بسم اللہ اور سورۂ اقراء کی اول آیات پڑھائیں۔قرآن مجید ایک معلمہ سے پڑھا۔غرض سلسلہ تعلیم روز بروز بڑھتا رہا۔دہلی کے ہم عصر فضلاء مولوی امام بخش صہبائی، آزردہ اور غالب وغیرہ کی علمی صحبتوں سے مستفید ہوئے ۔ورزشی فنون میں تیراکی والد سے سیکھی جو اس میں ماہرانہ کمال رکھتے تھے۔18 سال کی عمر میں خالہ کی صاحبزادی سے شادی ہوگئی۔وہ ایسی نیک دل خاتون تھیں کہ ان کا نقش تا مرگ قائم رہا۔

1835ء میں والد کے انتقال کے بعد دہلی میں ایک دفتر میں ملازمت کر لی جس کے لئے کسی مخصوص تعلیمی قابلیت کی شرط نہ تھی۔اس ملازمت میں دفتری کارروائی پر بہت جلد عبور حاصل کر لیا۔تیس سال میں اپنی قابلیت کی بدولت ترقی کرتے ہوئے منصف کے عہدے پر فائز ہوئے اور فتح پور سیکری میں متعین کئے گئے۔ 1842ء میں رخصت لے کر دہلی آئے اور قلعہ و دربار کے موروثی تعلقات کے لحاظ سے دربار شاہی میں چلے گئے۔بادشاہ نے جوادالدولہ عارف جنگ کا خطاب عطا کیا۔اگرچہ اب ان شاہی خطابات کی کوئی قدرو قیمت نہ تھی تاہم عوام کی نظر میں ان کی وقعت تھی۔کچھ مدت بعد دہلی تبادلہ ہوگیا۔یوں تو انہوں نے ختمِ تعلیم کے بعد مسلسل مطالعہ جاری رکھا مگر دہلی کے قیام میں مزید تعلیم پر توجہ دی۔فقہ اور عربی ادب کی تکمیل

کے بعد ایک مشہور عالم مخصوص اللہ خلق شاہ رفیق الدین سے مشکوۃ، جامع ترمذی اور صحیح مسلم کے کچھ حصے پڑھے اور آخر میں قرآن مجید کی سند لی، مطالعہ تعلیم کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جنوری 1855ء میں ترقی پا کر مستقل صدر امین مقرر ہوئے۔

10 مئی 1857ء کو جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو سرسید بجنور میں تھے۔ یہ سلسلہ چند مہینوں میں ختم ہو گیا اور پھر ہر جگہ انگریزی راج قائم ہوا۔ ہندوؤں نے متفقہ طور پر اسے غدر کا نام دیا اور اس کا تمام تر الزام مسلمانوں پر ڈالا۔ حکام بھی متاثر و متفق ہو گئے۔ سرسید احمد خان تمام حالات کے عینی شاہد تھے، انہوں نے تمام مسلمانوں کو ملزم بنانے کی مخالفت کی اور رسالہ ''اسباب بغاوتِ ہند'' تحریر کیا جو ان کی خود اعتمادی، صداقت، بے خوفی اور علمی قابلیت و تدبّر کی یادگار ہے۔ انہوں نے دلائل دے کر اس امر کو ظاہر کیا کہ مسلمانوں میں پہلے سے بغاوت کی کوئی سازش نہ تھی اور نہ کوئی بات اس ہنگامے میں مسلمانوں کے مذہب کے مطابق ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے اصلی سبب بتایا کہ ہندوستان کی آئین ساز کونسل میں ہندوستانیوں کو شریک نہیں کیا گیا تھا، حکومت اور رعایا میں غلط فہمی تھی۔ ایسے آئین اور ضابطے جاری ہوئے جو یہاں کے عوام کی عادت کے منافی تھے۔

چونکہ بغاوت کا الزام بالعموم مسلمانوں پر عائد کیا گیا اس لئے بعض انگریز بھی ان کے خلاف سخت مضمون لکھتے اور ثبوت و تائید میں مسئلہ جہاد کا حوالہ دیتے۔ سرسید کو ان خیالات و تعصبات سے سخت بے چینی تھی۔ انہوں نے 1860ء میں ایک سہ ماہی رسالہ ''خیر خواہِ مسلمانانِ ہند'' کے نام سے جاری کیا۔ اس کے پہلے شمارے میں انہوں نے لکھا: ''کوئی شرارت ایسی نہیں جو اس زمانہ میں نہ ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ یہ مسلمانوں نے کی، بے شک وہ کسی اور نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔'' رسالے کا ایک کالم انگریزی اور دوسرا اردو میں ہوتا تھا اور انگریزوں میں زیادہ تقسیم کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں مغربی علوم کا شوق پیدا کرنے اور جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لئے 1863ء میں غازی پور میں ''سائنٹفک سوسائٹی'' قائم کی۔ 1866ء میں ایک اخبار ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نام سے جاری کیا۔ اس کا اہم مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات وخیالات سے آگاہ کرنا، ہندوستانیوں کو انگریزی طرز حکومت سے آشنا کرنا اوران میں سیاسی شعور بیدار کرنا تھا۔

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی تباہی، دورجہالت اورجدید علوم سے غفلت پر 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی سے ہی غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی پسماندگی کا بڑا سبب جدید تعلیم وعلوم سے محرومی ہے۔ جدید تعلیم وتربیت ہی قومی عزت اور وقار کو بڑھانے اورا سے ترقی یافتہ قوموں کی صف میں لانے کا واحد ذریعہ ہے۔ کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی اعلیٰ منازل طے نہیں کرسکتی جب تک اس کے لوگوں کی بڑی تعداد پڑھی لکھی نہ ہو۔ 1875ء میں انہوں نے مدرستہ العلوم قائم کیا جس کا افتتاح مولوی محمد کریم ڈپٹی کلکٹر ارکن مجلس کے ہاتھوں ہوا۔ 1877ء میں اسے کالج میں تبدیل کر دیا گیا۔ سرسید احمد نے کالج قائم ہونے کے بعد ایک تقریب میں کہا کہ'' میں اپنی قوم کو آسمان کی مانند دیکھنا چاہتا ہوں تو میں اس کے اس حصہ کی جو نیلا نیلا سیاہ رُو، ڈراؤنا ہم کو دکھائی دیتا ہے کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا مگران ستاروں کو دیکھنا چاہتا ہوں جواس میں چمک رہے ہیں اورپُر کشش انداز کی چمک سے ہم کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ جن کے سبب اس سیاہ رُو آسمان کو بھی عجیب قسم کی خوبصورتی حاصل ہوتی ہے۔

''اے صاحبو! کیا تم اپنی قوم میں ایسے لوگ پیدا کئے بغیر جو قوم میں ایسے ہی چمکتے ہوں جیسے آسمان پر تارے، اپنی قوم کو معزز اور دوسری قوم کی آنکھوں میں باعزت بنا سکتے ہو، ہرگز نہیں۔ اے صاحبو! کیا تم ان ستاروں کو پیدا کئے بغیر اپنی پسماندہ قوم میں کوئی خوبی پیدا کر سکتے ہو۔ عام لوگوں میں تعلیم کو عام کیئے بغیر اعلیٰ تعلیم کا پھیلنا ناممکن ہے اور تمام دنیا کی تاریخ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔''

کالج کا عام نظمِ اقامت کیمبرج اور آکسفورڈ یونیوسٹیوں کے اصول پر قائم کیا گیا۔ مباحثوں میں بعض اساتذہ اور خود سرسید بھی حصہ لیتے تھے۔ اُردو اور انگریزی میں ایک میگزین بھی شائع ہوا جو نوجوانوں میں تعلیمی وتمدنی ترغیب اور قومی ہمدردی کے خیالات وجذبات پیدا کرنے کا ذریعہ تھا۔ تمام کھیلوں اور ورزشوں کے کلب تھے جن میں کرکٹ کلب نے بہت جلد شہرت حاصل کرلی تھی۔

سرسید مسلمانوں میں جذبہ عسکریت قائم رہنے کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کو اقامتی نظام کا جزو بنایا۔ باقاعدہ ڈرل کا انتظام ہوا جس کے لئے ایک فوجی آفیسر کی خدمات حاصل کی گئیں۔ پوری تربیت کے بعد اسناد بھی دی جاتی تھیں۔ 1892ء میں ایک رائڈ نگ سکول قائم ہوا جس کے طلباء کو گھڑسواری اور تلوار وغیرہ کے کرتب سکھائے جاتے تھے۔

دسمبر 1894ء میں اسٹریچی ہال میں طلباء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ’’آج میں تم کو ایسی کتابوں سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کسی کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں، نہ کسی پریس میں چھپی ہیں اور نہ مصنف کی بنائی ہوئی ہیں مگر قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پڑ کار مجسم ہیں مگر ان کا سمجھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے۔ اس کے معنی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ اس کو پڑھنے کے لئے ان کو کھولنے کی ضرورت نہیں، وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہر وقت کھلی ہوتی ہیں۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج یونیورسٹی کی لائبریریوں میں مت ڈھونڈو، وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہیں۔ وہ کتاب کیا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیوں کر سمجھو۔ اس کتاب کا نام کالج لائف یا نئی زندگی ہے۔ یہی اصلی کتاب ہے اور اس کا پڑھنا اور اس کو سمجھنا اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج (یونیورسٹی) کا ہے اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح سمجھ کر رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہیے ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں، بلکہ اس کی موت زندگی سے بہتر ہے۔‘‘

یہ اس کالج کا طفیل تھا کہ انگریزی تعلیم سے نفرت میں کمی آ گئی، علماء و امراء کے خاندانوں تک میں اس کے حصول کی رغبت پیدا ہوئی۔ اقامتی نظام سے نوجوانوں کی تربیت، اخلاق، ریاضت اور ڈسپلن وغیرہ میں بڑی کامیابی ہوئی۔ بحث و مباحثہ میں آداب مناظرہ کے ساتھ استدلال اور تقریر کا ملکہ پیدا ہوا، اختلاف عقائد کا زہر ختم ہوا۔ فرقہ واریت کی روایتی نفرت کی جگہ دوستی و یگانگت نے لے لی۔ مختلف صوبوں کے طلباء کے ایک جگہ رہنے سے ان میں مسلم قومیت اور اسلامی اخوت کی غیرت پیدا ہوئی۔ ان میں امداد باہمی کا جوش پیدا ہوا اور من حیث القوم مسلمان تعلیم کی جانب مائل ہو گئے۔

سرسید کی کامیابی میں ان کی پُرزور تحریر، خوش مزاجی، استدلال، کردار و گفتار میں ہم آہنگی اور وقت کی ضرورتوں کا اندازہ کرنے کی صلاحیت اور دل میں دردِ قومی نے اہم کردار ادا کیا۔ اور وہ دل و جان سے قومی خدمت میں کمربستہ ہو گئے۔ دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ وہ اپنے ساتھ والوں پر بھی اپنے جیسا جوش وخروش اور صداقت و راست بازی پیدا کرتے ہیں۔ یہی حال سید صاحب کے ساتھیوں کا تھا جن کی زبردست جماعت نے اپنے ادبی و سیاسی کارناموں سے جس طرح انگریزوں کے دل میں شکوک و شبہات مٹانے اور حکومت کی سخت پالیسی میں تبدیلی پیدا کی۔ بہت سے دلوں میں مسلم قوم کے ساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا صرف سرسید ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا، ڈاکٹر ہنٹر جن کی زہریلی کتاب پر سرسید نے سخت تنقید کی تھی۔ ایجوکیشن کمیشن کے صدر کی حیثیت سے جب علی گڑھ آئے تو بظاہر نہایت صاف دل اور ہمدرد تھے اور اپنی رپورٹ میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق ہمدردی ظاہر کی۔

سرسید نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ تیس چونتیس سال کی عمر میں شروع کیا اور رحلت تک جاری رکھا۔ اس میں جو کتابیں تصنیف و تالیف کیں اور جو رسائل لکھے ان کو مختلف ادوار میں تقسیم کرنے سے سرسید کے مطالعہ، رجحان، طبع، تحقیق و تنقید کی تدریج و ترقی کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ملازمت شروع کرنے کے بعد 1839ء میں دفتر کا دستورالعمل مرتب کیا جو اتنا مفید اور بہتر تھا کہ اس پر عمل کرنے کے لئے سرکاری ہدایت جاری ہوئی۔ 1840ء تک جام جم مرتب کی جو

امیر تیمور سے بہادر شاہ ظفر تک 43 بادشاہوں کی 17 خانوں میں جدولی تاریخ ہے ۔اس زمانے میں عہدہ منصفی کے لیے امتحان مشروط ہوتا تھا۔سرسید اور ان کے بڑے بھائی سید محمد امتحان کی تیاری کر رہے تھے اس لئے دونوں نے قوانین متعلقہ کا خلاصہ مرتب کیا جو انتخاب الاخوین کے نام سے شائع ہوا اور عرصہ تک امیدواران امتحان اس سے استفادہ کرتے رہے ۔اسی سلسلہ میں شرقی وغربی صدر عدالت کے فیصلوں کا انگریزی ترجمہ کر کے بطور نظائر (لائر پورٹ) شائع کیا۔ محافلِ میلاد میں پڑھنے کے لئے ایک رسالہ جلاء القلوب بذکر المحبوب تالیف کیا۔ 1847ء میں آثار الصنادید کے نام سے کتاب شائع کروائی ۔اس کتاب کی تالیف میں سرسید نے جس قدر محنت کی اور منہمک رہے، وہ پہاڑ کی چوٹی سر کرنے سے کم نہ تھی۔آثار الصنادید موضوع و مقصد کے لحاظ سے ایک اعلیٰ اور بےنظیر تصنیف ہے، جو سرسید کی ہمت و محنت کی بھی ایک یادگار ہے ۔سرسید کے دل میں اپنے وطن کی محبت کا جو مادہ اور قوم کی عظمتِ رفتہ کا جو احساس تھا، دراصل وہ ہی اس کتاب کی تالیف، جسمانی محنت، انہاک، دماغ سوزی، فراہمی حالات میں سرگرمی کا باعث ہوا۔

آثار الصنادید کے بعد مذہبی رسائل تالیف کئے ۔ساتھ ہی تصحیح آئین اکبری کا زہرہ گداز کام بھی کیا۔سرسید احمد خان کو طب کے ساتھ بھی رغبت تھی لیکن اللہ نے تو قوم کا نباض وطبیب بنا کر اس کا علاج ان کے ہاتھوں سے مقدر کیا تھا اس لئے یہ دلچسپی زیادہ مدت قائم نہ رہی ۔اس دور میں تاریخ فیروز شاہی برنی کی تصحیح بھی کی۔تصحیح کے ساتھ ایک مقدمہ بھی لکھا جس میں شاہانِ سلف کے زمانے کی تاریخوں اور مورخوں کا بالخصوص تذکرہ ہے ۔اس تصحیح شدہ کتاب کو 1862ء میں ایشیا ٹک سوسائٹی بنگال نے اردو میں شائع کیا۔خطبات احمدیہ ان کی شاہکار تصنیف ہے جو ہمارے مذہبی لٹریچر میں ایک لاثانی اضافہ ہے ۔انہوں نے کتاب لکھ کر ایک نئے علم الکلام کی بنیاد رکھی۔

سرسید کو فطری طور پر ادب وسخن سے دلچسپی تھی مگر فارسی ادب کے ساتھ اس درجہ ذوق تھا کہ ان کے زمانہ میں کالج کی عمارتوں پر سوائے صدر دروازہ پر عربی اشعار کے تمام عمارتوں پر جو

کتبے نصب ہوتے وہ فارسی زبان میں اور خود سرسید ہی کے لکھے ہوتے تھے۔اگر چہ ان کی فطرت میں ذوق شاعری بھی تھا،شعر وسخن سے کافی دلچسپی رکھتے تھے،نوجوانی میں چاروں طرف شعراء کا حلقہ کھنچا ہوتا تھا اور آخری عمر تک شعراء کی صحبت رہی لیکن وہ اس حلقہ میں کبھی شامل نہیں ہوئے۔

طلباء کے ساتھ شفقت کا رویہ بھی سرسید کی زندگی کا ایک نمایاں وصف تھا۔دوستوں کی اولاد ہی نہیں عام طلباء ان کی شفقت کا مرجع تھے۔خصوصاً کم سن اور چھوٹے بچوں کے ساتھ پدرانہ جذبہ تھا۔یہ شفقت ہی تھی کہ سرسید نے غریب طلباء کی امداد نہ صرف خود کی بلکہ اس کے لئے ہر ممکن تدبیر کی اور دوستوں سے بہ اصرار کروائی۔یہی وجہ ہے کہ جو طالب علم علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے،وہ سرسید کی محبت وعقیدت میں سرشار یک دل و زبان تھے۔

سرسید احمد خان طلباء سے اپنے ایک خطاب میں کہتے ہیں :اے عزیزو! تم جانتے ہو کہ مجھ کو تم سے تمہارے حقیقی والدین سے کم محبت نہیں ہوسکتی۔میں تمہاری دینی و دنیاوی ترقی کے لئے ہر وقت دعا کرتا ہوں اور جس وقت میں تم میں سے ان کو دیکھتا ہوں جو کامیاب ہیں تو میرے دل کو نہایت خوشی ہوتی ہے اور جو اپنے خیال کے موجب ابھی کامیاب نہیں ہوئے ان کے لئے دعا کرتا ہوں۔لیکن اے عزیزو! تم کو سمجھنا چاہیے کہ جو تعلیم تم کو دی گئی ہے اس کا اصلی مقصد کیا ہے؟ اس کا اصلی مقصد یہ نہیں کہ دولت ہی حاصل ہو بلکہ تمہاری اندرونی و دلی و دماغی ترقی مقصود اصلی ہے۔تم نے دیکھا ہوگا کہ جو شخص ایک حرف نہیں جانتا مگر اللہ نے اس کو اتفاقیہ بے انتہا دولت دے دی ہے،لیکن مجھ کو امید ہے کہ تم ایسی دولت کی بہت زیادہ پرواہ نہیں کرو گے اور تم اپنے دل اور دماغ کی دولت پر ناز کرو گے۔''

سرسید احمد خان 24 مارچ 1898 کو بیمار ہوئے اور 28-27 مارچ کی درمیانی شب دس بجے انتقال کر گئے۔ان کی وفات ایک قومی سانحہ تھی۔برِ عظیم کے طول وعرض میں تعزیتی جلسے منعقد ہوئے۔''پائنیر'' نے جو اس زمانے کا نہایت ممتاز انگریزی اخبار تھا لکھا کہ سرسید کی

وفات کے ساتھ اس نہایت مفید اور بارآور اور زبردست سیاسی طاقت کا خاتمہ ہو گیا جس نے بیسویں صدی کے آخری حصے میں ہندوستان کی اسلامی دنیا کو متحرک کیا۔

علوم شرقیہ کے مستند سکالر ایچ اے آر بڑے احترام سے سرسید کا ذکر کرتے ہیں: ''مایوسی کے اندھیرے میں مسلمانوں کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان کو روشنی میں لے جائے اور ان کی شکستہ دنیا کی تعمیر کردے۔ یہ شخص سرسید احمد خان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے اس عظیم رہنما کی عظمت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ وہ سادگی، سچائی، بلند دماغی، مقصد کی مضبوطی، دل کی گہرائی اور ذاتی کشش جیسی خصوصیات کے مالک تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ مسلم دنیا جدید تعلیم حاصل کرے۔ ان کو اپنے مقصد میں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ ان کا اٹھایا ہوا خمیر پھیل چکا ہے اور آج اس مکتب خیال کے کتنے ہی لوگ ہیں جنہوں نے جدید باتوں کو اپنایا ہے اور ماضی کی اہم چیزوں سے بھی رشتہ قائم کر رکھا ہے۔ تمام لوگ اس مکتب خیال یعنی اسلام کو مغربی علوم، اخلاقیات، معاشیات کے قریب لانے کے لئے کام کر رہے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ وہ دکھا رہے ہیں کہ اسلام ایک غیر محدود غیر ترقی پسند مذہب نہیں بلکہ ایک عالمگیر اپیل اور عملی دنیا سے ہم آہنگ ہونے کی قوت رکھتا ہے۔''

*****

ایک منزل ۔۔۔۔ دو قائد

پروفیسر احمد سعید

...•••...

علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری برسوں میں یونینسٹ پارٹی کی تمام تر مخالفت کے باوجود پنجاب میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ قائداعظمؒ بھی اس کے معترف تھے۔ اکتوبر 1937ء میں قائداعظم محمد علی جناحؒ نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے نام پیغام میں فرمایا: ''آج کل مسلمانوں کا اہم ترین فرض یہی ہے کہ وہ اپنی تنظیم کریں اور ہندوستان کی واحد اسلامی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کے جھنڈے تلے ایک محاذ پر جمع ہو جائیں۔ ہماری امیدیں نوجوانوں سے وابستہ ہیں جنہیں عنقریب مستقبل کا بوجھ اور ذمہ داری اٹھانا پڑے گی۔ میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ خیال آرائیوں سے گمراہ ہونے کی بجائے حقائق کی روشنی میں عملی کام کر دکھائیں۔ میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا گو ہوں۔''

علامہ اقبالؒ نے اپنے پیغام میں قائداعظمؒ کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ ''میں مسٹر جناح کے ایک ایک لفظ کی تائید کرتا ہوں۔ مسلمان نوجوانوں کو اس سے بہتر مشورہ نہیں دیا جا سکتا۔''

1937ء میں مسٹر نہرو نے بیان دیا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو سیاسی پارٹیاں ہیں: حکومت اور کانگریس۔ اس پر قائداعظمؒ نے پنڈت نہرو کو للکار کر کہا کہ نہیں ایک تیسری پارٹی (مسلمان/مسلم لیگ) بھی موجود ہے۔ ساتھ ہی قائداعظمؒ نے کانگریس کی اس روش پر بھی افسوس ظاہر کیا جو وہ مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کر کے اختیار کر رہی تھی۔ اس پر پنڈت نہرو نے قائداعظمؒ پر سخت نکتہ چینی کی اور کہا کہ ہندوستان میں صرف

ایک قوم ہے جس کی نمائندگی کانگریس کرتی ہے ۔علامہ اقبالؒ نے اس صورت حال پر جو بیان دیا، اس سے قائد کے متعلق علامہؒ کے دلی جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے ۔علامہؒ نے فرمایا: ''میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مسٹر نہرو نے بلاوجہ مسٹر جناح کے ساتھ الجھنے کی کوشش کی ہے ۔مسٹر جناح آج مسلمانوں کے سب سے بڑے اور سب سے بااعتماد لیڈر ہیں ۔انہوں نے اپنے ملک کی جو خدمت کی ہے وہ کسی اور لیڈر نے نہیں کی ۔مسٹر جناح تخیل کی دنیا میں پرواز کرنے کی بجائے حقیقت بینی کو ترجیح دیتے ہیں ۔اس لئے ان کی قوم پرستی اور حب الوطنی حقائق و واقعات کے صحیح تجزیے پر مبنی ہے ۔مجھے امید ہے کہ مسٹر نہرو کو جلد اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ مسٹر جناح مسلمانوں میں کتنی بلند حیثیت اور ارفع مقام کے مالک ہیں ۔مسلمانوں کی طرف سے اگر کسی شخص کو بات کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ صرف مسٹر جناح ہیں ۔''

علامہ اقبالؒ اب قائد اعظمؒ کے سوا کسی اور کو مسلمانوں کا قائد تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے ۔ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے پنڈت نہرو اور میاں افتخار الدین کی علامہ اقبالؒ کے ساتھ ایک ملاقات اور گفتگو کا ذکر کیا ہے ۔اس ملاقات میں میاں افتخار الدین نے علامہ اقبالؒ سے کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے، مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں ۔اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس کے ساتھ بات چیت کریں تو بہتر نتیجہ نکلے گا'' ڈاکٹر صاحبؒ لیٹے ہوئے تھے ۔یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے اور انگریزی میں فرمانے لگے :اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر مسٹر جناح کے مقابلے پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں ۔میں آپ کو بتلا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں ۔میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں ۔''

میاں افتخار الدین اور علامہ اقبالؒ کی ملاقات 15 جنوری 1938ء کا نقشہ کھینچتے ہوئے سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں کہ ''میاں افتخار الدین نے کہا کہ مسلمان بھی آزادیٔ وطن کے ایسے ہی خواہشمند ہیں جیسے ہندو ۔وہ بھی شہنشاہیت کے ایسے ہی دشمن ہیں جیسے کوئی اور ۔آپ حق

بات کیوں نہیں کہہ دیتے مسلمانوں پر آپ ہی کا اثر ہے۔مسٹر جناح کو کون سنتا ہے۔'' اس پر علامہ اقبالؒ نے فرمایا: ''مجھے یہ کہنے میں کیا عذر ہے کہ مسلمان آزادی کے طالب اور استعمار و شہنشاہیت کے دشمن ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ جناح تو حق بات سن لیتے ہیں، نہیں سنتی تو کانگریس۔''

قائداعظم محمد علی جناحؒ مسلمانوں کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کی جو کوشش کر رہے تھے ان کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا: ''اس امر سے تو شاید آپ کو (میاں افتخارالدین) بھی انکار نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کا اتحاد ایک ضروری امر ہے تو جناح کی قیادت سے جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا ہوا ہے، کیا اسے اس لئے ختم کر دیا جائے کہ ہندو نہیں چاہتے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم متحد ہو جائیں۔''

قائداعظمؒ نے مسلم لیگ کے اجلاس دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مختلف صوبوں میں کانگریسی وزارتوں کے طرزِ عمل کا ذکر کیا۔قائدؒ نے خصوصیت سے بندے ماترم اور اردو زبان کا ذکر کیا۔قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں بندے ماترم کے متعلق فرمایا کہ ''اس سے شرک کی بو آتی ہے اور یہ مسلمانوں کے خلاف ایک قسم کا نعرۂ جنگ ہے۔'' کانگریسی صوبوں میں ہندوستانی کے جبری نفاذ کا ذکر کرتے ہوئے قائدؒ نے فرمایا: ''میرے خیال میں یہ چیز اسلامی تمدن اور اردو زبان کے لئے پیغامِ مرگ ہے اور ہمارے بچوں کے لئے مہلک ثابت ہوگی۔''

علامہ اقبالؒ کو قائداعظمؒ کی یہ تقریر جب پڑھ کر سنائی گئی تو علامہؒ نے اس پر بڑی مسرت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ''دو باتوں سے جی خوش ہوا ہے۔ایک مسٹر جناح کے اس کہنے پر کہ بندے ماترم سے شرک کی بو آتی ہے اور دوسرے اس پر کہ ہندی ہندوستانی تحریک دراصل اردو پر حملہ ہے اور اردو کے پردے میں بالواسطہ اسلامی تہذیب پر بھی۔''

1936ء کے آخری دنوں میں ایک روز قائداعظمؒ کی امانت، دیانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا۔علامہ اقبالؒ نے فرمایا: ''مسٹر جناح کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے جو آج

تک ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آئی ۔ حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے تو علامہؒ نے فرمایا: ''انہیں نہ تو آلودہ کیا جاسکتا ہے نہ خریدا جاسکتا ہے۔''

علامہ اقبالؒ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی قیادت پر مکمل یقین رکھتے تھے۔ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ مسلمانوں کی مشکلات کا مداوا صرف یوں ہوسکتا ہے کہ مسلمان مسٹر جناح کے ہاتھ مضبوط کریں ۔مسلم لیگ ہی کی سربراہی میں متحدہ محاذ قائم ہوسکتا ہے ۔مسلم لیگ کامیاب ہو گی تو مسٹر جناح کے سہارے ۔مسٹر جناح کے سوااب اور کوئی مسلمانوں کی قیادت کا اہل نہیں۔

''علامہ اقبالؒ نے اپنی اس رائے کا اظہار یونینسٹ پارٹی کے ترجمان روزنامہ'' انقلاب'' کے مدیران غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک سے بھی کیا جو علامہؒ سے ملاقات کی غرض سے آئے تھے ۔ دوران گفتگو علامہؒ نے دونوں حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: '' ہمارے مسائل کا حل صرف ایک ہی ہے کہ یونینسٹ پارٹی توڑ دی جائے اور مسلم لیگ جو متحدہ محاذ قائم کر رہی ہے، سب اس میں شامل ہو جائیں ۔مسلمانوں کی قیادت صرف مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہے، ہمیں مسٹر جناح سے بہتر کوئی آدمی نہیں مل سکتا۔''

علامہ اقبالؒ قائداعظمؒ کی نظر میں

قائداعظم محمد علی جناحؒ بھی کھلے دل سے علامہ اقبالؒ کی خدمات کا اعتراف کرتے تھے ۔1943 میں لاہور کے مشہور پبلشر شیخ محمد اشرف نے '' علامہ اقبال کے خطوط بنام مسٹر جناح'' شائع کئے ۔ان خطوط کا دیباچہ قائداعظمؒ نے تحریر کیا ۔اس دیباچہ میں قائداعظمؒ نے علامہ اقبال کی مخلصانہ اور بے لوث خدمات کا ذکر کیا ۔یہاں یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قائد اعظمؒ نے ان خطوط کو'' تاریخی خطوط'' قرار دیا ۔میاں بشیر احمد کو ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

''مائی ڈیر میاں بشیر احمد

کچھ پرانے کاغذات دیکھتے ہوئے مجھے ڈاکٹر محمد اقبال کے چند پرانے خطوط ملے جو کہ انہوں نے مجھے اپنی وفات سے قبل 1935ء اور 1937ء کے دوران لکھے تھے ۔ چونکہ یہ خطوط

تاریخی اہمیت حاصل کر چکے ہیں اس لئے میں ان کو محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔لیکن بد قسمتی سے ان خطوط کے جو جوابات میں نے تحریر کئے، وہ دستیاب نہیں ہیں کیونکہ میں نے ان خطوط کی نقل اپنے پاس نہیں رکھی۔ کیا آپ مہربانی فرما کر ان خطوط کے جوابات حاصل کرنے کی کوشش فرمائیں گے اور مجھے جلد از جلد ارسال کریں گے۔"

قائد اعظمؒ ان خطوط کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں: "یہ خطوط جو اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں، ہمارے قومی شاعر، فلسفی علامہ محمد اقبالؒ نے مئی 1936ء سے نومبر 1937ء کے درمیانی عرصہ میں مجھے لکھے۔ یہ عرصہ مسلمانان ہند کی تاریخ کے ایک ایسے دور کے ساتھ آتا ہے جو نہایت اہم واقعات سے پُر ہے۔یعنی آل انڈیا مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے جون 1936ء میں قیام اور اکتوبر 1937ء میں لکھنؤ کے تاریخی اجلاس کا درمیانی عرصہ۔ اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کی ملحقہ شاخیں مسلم لیگ کی طرف سے 1935ء کے قانونِ حکومت ہند کے تحت ہونے والے انتخابات کے لئے مسلمانوں کی رائے عامہ کو ساتھ ملایا جائے۔ان دونوں اہم مقاصد کا حصول زیادہ تر اپنے دوستوں بالخصوص علامہ اقبالؒ کی بے لوث تائید، کوششوں، بے غرض مساعی اور سچی کوششوں کے سبب ہو سکا اور مسلم لیگ اس مختصر عرصہ میں قوت پکڑتی چلی گئی۔ان تمام صوبوں میں جہاں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کئے گئے اور مسلم لیگ پارٹیاں بنائی گئی وہاں مسلم لیگ کے امیدواروں نے جس قدر نشستوں کے لئے انتخابات لڑے، ان میں ساٹھ سے ستر فی صد تک نشستیں جیت لیں۔ مدراس کے دور دراز علاقے سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے تک ہر صوبے میں سینکڑوں ڈسٹرکٹ اور ابتدائی لیگیں قائم ہوگئیں۔مسلم لیگ نے کانگریس کی جاری کردہ نام نہاد عوامی رابطہ کی تحریک جو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور لیگ کو مطیع کرنے کی غرض سے شروع کی گئی، پر کاری ضرب لگائی۔مسلم لیگ نے بیشتر ضمنی انتخاب بھی جیت لئے اور جو لوگ ریشہ دوانیوں اور عیارانہ سازشوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی فکر میں رہتے تھے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی عام حمایت حاصل نہیں ہے، ان سب کی

امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اجلاس لکھنؤ سے صرف اٹھارہ ماہ قبل آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت کی حیثیت سے اُبھری۔ اس کا ایک ترقی پسندانہ اور ترقی پذیر پروگرام بھی وجود میں آ گیا اور اس کے زیر اثر وہ صوبے بھی آ گئے جو وقت کی کمی یا تیاری کی کمی کے سبب ابھی تک مسلم لیگ پارلیمانی بورڈوں کی سرگرمیوں سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ لکھنؤ اجلاس نے یہ بات واضح کر دی کہ مسلمانوں کے تمام طبقوں اور گروہوں میں مسلم لیگ کو کس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ مسلم لیگ کی ایک بڑی کامیابی یہ بھی تھی کہ اکثریتی اور اقلیتی صوبوں میں اس کی رہنمائی تسلیم کر لی گئی۔ اس کامیابی کا سہرا سر محمد اقبالؒ کے سر ہے۔ سکندر جناح پیکٹ پر عمل کے سلسلے میں ان کے اپنے کچھ شکوک تھے اور وہ اس کی تعمیر اور روشن نتائج کو جلد از جلد دیکھنے کے متمنی تھے تا کہ ابھرتے ہوئے شکوک اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے، مگر افسوس کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ پنجاب میں ہمہ گیر ترقی ہوئی اور اب یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ مسلمان مضبوطی کے ساتھ مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد ان خطوط کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ تاہم مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ علامہ اقبالؒ کو میں نے جو جواب لکھے، وہ دستیاب نہیں ہیں۔ مذکورہ عرصہ کے دوران میں تن تنہا ذاتی سٹاف کی معاونت کے بغیر کام کرتا تھا۔ چونکہ مجھے تمام خطوط کے جوابات خود ہی لکھنا ہوتے تھے، اس لئے ان کی نقول اپنے پاس نہ رکھ سکا۔ میں نے اس ضمن میں لاہور میں اقبال ٹرسٹ کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جوابات وہاں بھی دستیاب نہیں۔ لہٰذا میرے لئے کوئی اور صورت نہ تھی کہ ان خطوط کو اپنے جوابات کے بغیر ہی شائع کروں کیونکہ میرے نزدیک یہ خطوط بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، بالخصوص وہ خطوط جن میں علامہ اقبالؒ نے مسلم ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں خیالات کا اظہار نہایت واضح الفاظ میں کیا ہے۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے تصورات سے ہم آہنگ تھے۔ ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے، ان کے گہرے مطالعے اور غور و خوض کے بعد میں بھی ان ہی نتائج تک پہنچا جو علامہ اقبالؒ کے تھے۔ یہی تصورات تھے

جو بعد میں مسلمانانِ ہند کی متفقہ مرضی کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد کی صورت اختیار کر گئے جسے قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے جو 24 مارچ 1940 کو منظور کی گئی تھی۔"

علامہ اقبال 21 اپریل 1938ء کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ علامہؒ کی ذات آل انڈیا مسلم لیگ اور قائداعظم محمد علی جناحؒ دونوں کے لئے زبردست قوت کا سبب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ قائدِ اعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ علامہ اقبالؒ کی وفات پر "نوجوانانِ دکن" کی جانب سے ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں قائداعظمؒ نے اپنے پیغام میں فرمایا:

"مجھے علامہ اقبال کی وفات کی خبر سن کر سخت رنج ہوا۔ وہ عالمی شہرت کے ممتاز شاعر تھے۔ ان کی شہرت اور ان کے کام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انہوں نے ملک اور مسلمانوں کی اتنی خدمات انجام دی ہیں کہ ان کے ریکارڈ کا مقابلہ عظیم ترین ہندوستان کے ریکارڈ سے کیا جاسکتا ہے۔ حال تک وہ پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے۔ بدقسمتی سے اچانک علالت نے انہیں استعفیٰ پر مجبور کر دیا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام کے حامی تھے۔ علامہ اقبالؒ میرے لئے رہنما تھے، دوست اور فلسفی۔ جن تاریک ترین لمحوں سے مسلم لیگ کو گزرنا پڑا، وہ ان میں چٹان کی طرح قائم رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی متزلزل نہیں ہوئے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف تین دن قبل انہوں نے اس کامل اتحاد کا ذکر پڑھا یا سنا ہوگا جو کلکتہ میں پنجاب مسلم قائدین کے مابین ہوگیا اور آج میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ پنجاب مکمل طور پر اب مسلم لیگ کے ساتھ اور مسلم لیگ کے پرچم تلے آچکے ہیں جو یقیناً علامہ اقبالؒ کے لئے عظیم ترین اطمینان کا واقعہ تھا۔ اس صدمے میں میری نہایت مخلصانہ دلی ہمدردیاں ان کے خاندان کے ساتھ ہیں۔ اس نازک وقت میں ان کی وفات سے ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان پہنچا ہے۔"

4 دسمبر 1938ء کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس قائد اعظمؒ کی زیر صدارت منعقد ہوا جہاں علامہ اقبالؒ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل تعزیتی قرارداد منظور کی گئی:

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ایک فلسفی اور عظیم قومی شاعر کی خدمات کا اعتراف کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ اپنے مستقبل کی تعمیر اپنے ماضی کی روایات کو سامنے رکھ کر کریں۔ اگرچہ وہ آج ہم میں موجود نہیں لیکن اپنی لافانی شاعری کے ذریعے وہ زندہ رہیں گے اور ان کا کلام تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ کونسل کا یہ اجلاس ان کی موت پر انتہائی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

26 دسمبر 1938ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ پٹنہ میں اپنی صدارتی تقریر میں علامہ اقبالؒ کی وفات پر گہرے رنج اور دکھ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "علامہ اقبالؒ میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی عظیم شاعری ہندوستانی مسلمانوں کی خواہشات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ ان کی شاعری ہمارے لئے اور ہماری آئندہ نسلوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔"

مارچ 1940ء میں قائداعظم محمد علی جناحؒ نے یوم اقبالؒ کے سلسلے میں یونیورسٹی ہال لاہور میں منعقدہ ایک جلسے کی صدارت فرمائی۔ قائداعظمؒ نے اپنی تقریر میں علامہ اقبالؒ کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: "اقبال میرے گہرے دوست تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ ابتدا میں ایک قسم کی علمی جماعت تھی۔ 1936ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل 1936ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا، وہ اقبالؒ تھے۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے فوراً لبیک

کہااوراس وقت سے تا دم مرگ علامہ اقبالؒ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ اقبالؒ بہت بڑے آدمی تھے اور بلا شبہ بہت بڑے شاعر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی، علامہ اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے، لیکن دنیا میں ''شاعرِ اعظم'' کی حیثیت سے متعارف تھے۔ اقبالؒ نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات انجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ ایک مرتبہ میں علی گڑھ سے بریلی کا سفر کر رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے؟ اچانک ان سب نے اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھنا شروع کر دیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

''شعراء اقوام میں جان پیدا کرتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا کہ اسے جب شیکسپئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا میں شیکسپئر کو کسی قیمت پر نہ چھوڑوں گا۔ میرے پاس سلطنت نہیں ہے، اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا۔''

12 مارچ 1941ء کو یوم اقبالؒ کی ایک مجلس میں قائد اعظمؒ نے خطاب کیا۔ یہ جلسہ پنجاب یونیورسٹی ہال میں منعقد ہوا جہاں قائد اعظمؒ نے علامہ اقبالؒ کو زبردست خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر میں اس تقریب میں شامل نہ ہوتا تو اپنے آپ کے ساتھ بڑی بے انصافی کرتا۔ میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسے میں شامل ہو کر اقبال مرحوم کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شخصیت عالمگیر ہے۔ وہ مشرق کے بہت بڑے ادیب، بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے، لیکن اس حقیقت کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ

ایک بہت بڑے سیاست دان بھی تھے۔انہوں نے آپ کے سامنے ایک واضح اور صحیح راستہ رکھ دیا ہے جس سے بہتر کوئی اور راستہ نہیں۔وہ دورِ حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔مجھے فخر ہے کہ ان کی قیادت میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا مجھے موقع مل چکا ہے میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے، یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور اس پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے۔ان کی علمی اور ادبی گل کاریوں کی وجہ سے ان کا نام جریدۂ عالم پر ثبت ہو چکا ہے۔" نومبر 1942 میں قائداعظمؒ لاہور تشریف لائے اور 22 نومبر 1942ء کو میاں بشیر احمد اور مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں کے ہمراہ علامہ اقبالؒ کے مزار پر پہنچے۔فاتحہ خوانی کے بعد قائداعظمؒ کو علامہ اقبال کا وہ فقرہ یاد دلایا گیا جو انہوں نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا تھا کہ "مسٹر جناح! آپ واحد شخص ہیں جو اسلامی ہند کو اس سیلاب سے بچا سکتے ہیں جو 1935ء کے آئین حکومتِ ہند کے عقب میں آ رہا ہے" تو قائداعظمؒ نے فرمایا: "میں اس زمانہ میں تین مرتبہ پنجاب آیا، اگر مجھے تسکین ملی تو اس مردِ قلندر۔۔۔اقبالؒ۔۔کی بارگاہ میں" قائد اعظمؒ کو "ذوق وشوق" کے چند شعر سنائے گئے تو فرمایا: "روحِ مسلمان میں واقعی اضطراب ہے اور انشاءاللہ ہم ایک عظیم الشان اور پاکیزہ انقلاب لانے میں کامیاب ہوں گے۔"

1944ء میں یوم اقبالؒ کے موقع پر قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے اقبالؒ کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: "میں اس دن جبکہ ہمارے عظیم ملی شاعر، فلاسفر اور مفکر علامہ اقبالؒ کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوص قلب سے انہیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی اطمینان بخشیں۔ اگرچہ آج اقبالؒ ہمارے درمیان موجود نہیں، لیکن ان کا غیر فانی کلام ہمارے دلوں کو گرماتا رہے گا۔اُن کی شاعری جو کہ حُسنِ بیان کے ساتھ حُسنِ معانی کی بھی آئینہ دار ہے، ان کے دل و دماغ میں پنہاں ان خدمات اور افکار کی عکاسی کرتی ہے جن کا سرچشمہ اسلام کی جامع تعلیم ہے۔اقبالؒ

پیغمبر اسلام کے سچے اور مخلص پیرو کار تھے۔ وہ اول وآخر مسلمان اور اسلام کے صحیح مفسر تھے۔ اقبالؒ محض ایک فلاسفر اور معلم ہی نہ تھے۔ بلکہ وہ حوصلہ، عمل، استقامت اور خوداعتمادی کے پیکر بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر انہیں اللہ تعالیٰ پر لازوال ایمان وایقان تھا۔ وہ اسلام کی خدمت کے جذبہ سے سرشار رہتے۔ ان کی زندگی ایک شاعر کے بلند مقاصد کے ساتھ ایک عملی انسان کی حقیقت پسندی کا حسین امتزاج تھی۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان کے ساتھ ان کی مسلسل جدوجہد اُن کے پیغام کا جُزو لازم ہے۔ اس لحاظ سے وہ صحیح معنوں میں اسلامیت کا نمونہ تھے۔ انہیں اسلام کے اصولوں سے غیر فانی لگاؤ تھا اور ان کے نزدیک زندگی میں کامیابی کا راز اپنی خودی کا شعور حاصل کرنا تھا۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ اسلام کی تعلیم پر نہ صرف ایمان رکھتے تھے، بلکہ اسے شاہراہِ عمل بھی گردانتے تھے۔ اقبالؒ ایک عظیم شاعر اور فلاسفر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عملی سیاست دان بھی تھے۔ جہاں انہیں ایک طرف اسلام کے مقاصد سے محبت اور عقیدت تھی، وہاں وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنہوں نے پہلے پہل ایک اسلامی مملکت کا خواب دیکھا تھا۔ ایک ایسی مملکت جو کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور جنوب مشرقی حصوں پر مشتمل ہوگی جو کہ تاریخی لحاظ سے مسلمانوں کا وطن سمجھے جاتے ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے جن کی جھلک علامہ اقبالؒ کے کلام میں موجود ہے تاکہ ہم بالآخر پاکستان حاصل کر کے اپنی مکمل طور پر خودمختار اور آزاد مملکت میں ان اصولوں کو جاری و ساری کر سکیں۔''

*****

برصغیر کے مسلمانوں کا نشانِ منزل

پروفیسر حسینن کاظمی

...•••...

جو لوگ اپنی فکر، سوچ بچار اور قوتِ عمل سے تاریخ میں روشن اور بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں، وہ قومی عظمت کی علامت بن جاتے ہیں ۔اُن کی گفتار، اُن کا کردار اور جذبہ عمل دلوں کو گرماتا، حوصلوں کو بڑھاتا اور زندگی کی راہیں روشن کرتا ہے ۔ یہ لوگ انسان ہی ہوتے ہیں، ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور خامیاں بھی، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی خامیوں کا اثر ان کی ذات تک محدود رہتا ہے اور خوبیاں پوری قومی زندگی پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہیں، لہٰذا انصاف کا تقاضا ہے کہ ان کے کردار کی خوبیاں بھرپور انداز میں نمایاں کی جائیں تا کہ نئی نسلوں کی نگاہ ان کے کردار کے مثبت پہلوؤں پر رہے جن سے وہ اپنے فکر و عمل کی تعمیر میں مدد لے سکیں ۔ اچھے اور سچے رہنماؤں کی زندگی کے روشن پہلو نئی نسلوں میں دیانت، امانت اور صداقت کا شعور بیدار کرتے ہیں اور اس طرح ان میں ذاتی اغراض سے بلند ہونے کی ہمت اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے ۔

قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک ایسا نام ہے، جسے پاکستان کے وجود سے الگ نہیں کیا جاسکتا ۔اس نام پر بھروسہ اور اعتماد اس پوری تحریک پر بھروسے اور اعتماد کی ضمانت ہے جس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا ۔پاکستان کے قیام سے قائدِ اعظمؒ یا ان کے اہلِ خاندان کو کوئی خصوصی مراعات حاصل نہیں ہوئیں ۔قیامِ پاکستان کے بعد قائدِ اعظمؒ 13 ماہ سے بھی کم عرصہ زندہ رہے ۔ وہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ضرور بنے، لیکن یہ عہدہ قوم کی جانب سے ان کی خدمت میں ایک ہدیۂ اخلاص تھا ۔

قیامِ پاکستان سے قبل برطانوی ہند کی مجلسِ قانون ساز میں کانگریس کی جانب سے علی الاعلان قائدِ اعظمؒ کو آزاد ہندوستان کی تاحیات وزارتِ عظمٰی کی پیش کش کی گئی تھی (یہ غالباً 1945 کی بات ہے) اور اس اسمبلی کی کارروائی کا ریکارڈ گواہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اس پیش کش کو ٹھکرا دیا تھا۔ پاکستان کا گورنر جنرل بننے سے قائدِ اعظمؒ کی عزت و وقار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے رہنما کی حیثیت سے ان پر جو اعتماد کیا تھا، وہ گورنر جنرل کے عہدے کے ظاہری وقار سے کہیں زیادہ قیمتی اور قابلِ فخر اثاثہ تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے 1943ء والے دہلی کے سالانہ اجلاس میں قائدِ اعظمؒ کو تاحیات مسلم لیگ کا صدر بنانے کی تجویز پیش ہوئی تھی۔ وہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہو جاتی، لیکن خود قائدِ اعظمؒ نے اسے منظوری کے لیے پیش نہیں ہونے دیا اور کہا کہ میرے لیے یہی بہت بڑا اعزاز ہے کہ قوم کے نمائندے اگر چاہیں تو ہر سال اپنا صدر منتخب کر لیں۔

1942ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس الہ آباد میں منعقد ہوا۔ اس زمانے میں سٹیفورڈ کرپس برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستانی رہنماؤں سے گفتگو کے لئے آئے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک تجویز پیش ہوئی کہ ان مذاکرات کے سلسلے میں قائدِ اعظمؒ کو مکمل اختیارات دے دیے جائیں۔ مولانا حسرت موہانیؒ اس تجویز کی مخالفت کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اجلاس میں ہر سمت شور مچ گیا لیکن قائدِ اعظمؒ نے نہایت سخت لہجے میں لوگوں کو خاموش ہو جانے پر مجبور کر دیا اور مولانا حسرت موہانیؒ نے اپنی مخالفانہ تقریر مکمل کر لی۔ پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جب یہ فیصلہ ہوا کہ حکومت کے عہدیدار مسلم لیگ کے عہدیدار نہ رہیں تو قائدِ اعظمؒ نے اپنے لئے مسلم لیگ کا کوئی عہدہ قبول نہیں کیا۔

یہ چند واقعات بہت مختصر طور پر اس لئے پیش کئے گئے ہیں کہ بعض اوقات محض سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر چھوٹے چھوٹے مفروضہ واقعات پیش کر کے قائدِ اعظمؒ کی شخصیت کی بڑائی کم

کرنے کی بے وجہ کوشش کی جاتی ہے۔ ایسی کوشش کرنے والوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پاکستان کی تحریک اور پاکستان پر نئی نسلوں کا اعتماد مجروح کیا جائے۔

قائدِاعظمؒ کے سلسلے میں ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ وہ برِصغیر میں آباد مسلمان قوم کے صرف وکیل نہیں تھے بلکہ وکالت کے اس فریضے کی ادائیگی میں ان کا جذبۂ ایمانی بھی کارفرما تھا۔ بلا شبہ انہوں نے اپنی بے مثال قوتِ استدلال کے ذریعے مخالفوں کو ہمارا قومی موقف تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا اور برِصغیر کی سیاسی تاریخ کے نازک ترین دور میں اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل وکرم اور اپنی قیادت کے ذریعے قوم کو آزادی کی منزل تک پہنچایا، لیکن قومی موقف کی حمایت میں وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، خود ان کے جذبہ و یقین کا اظہار بھی تھا۔ اسی صداقت، دیانت اور یقین کی گہرائی نے ان کی شخصیت میں اور ان کی آواز میں پوری قوم کے لئے بے پناہ کشش پیدا کر دی تھی۔ اس رشتے کے سوا قائدِاعظمؒ اور ایک عام مسلمان کی زندگی کے مابین کوئی دوسرا رشتہ موجود ہی نہیں تھا، لیکن یہ ایک رشتہ اس قدر محکم اور مضبوط تھا کہ اس کے بعد کسی بھی دوسرے رشتے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

قائدِاعظمؒ اپنی سیاسی زندگی کے ہر دور میں آزادی کے علمبردار رہے۔ جب تک ان کو یقین رہا کہ برِصغیر کی آزادی ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے یکساں فوائد کی ضامن ہوگی، وہ اس کے لئے کوشاں رہے۔ جب انہوں نے مکمل تجزیے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ برِصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے ان کی اپنی ایک آزاد مملکت کا قیام ضروری ہے تو پھر اس منزل کا حصول انہوں نے اپنا مقصدِ حیات بنا لیا۔ قائدِاعظمؒ پورے غور وخوض کے بعد دو قومی نظریے کے قائل ہوئے تھے جس کے بعد انہوں نے برملا یہ اعلان کیا کہ برِصغیر کے مسلمان اقلیت نہیں، ایک قوم ہیں اور آزادی اور خود ارادیت ان کا بنیادی حق ہے۔ یہ حقیقت کہ مسلمان ایک جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں اور عالمگیر ملّتِ اسلامیہ کا حصہ ہیں، قائدِاعظمؒ کے لئے جزوِ ایمان بن گئی تھی۔ انہوں نے جداگانہ مسلمان قوم کا نعرہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت قبول نہیں کیا تھا، وہ ہندو

قیادت سے سیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانوں کے جُدا گانہ تشخص کے قائل ہی نہیں ہُوئے تھے بلکہ یہ بات ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں تھی کہ بین الاقوامی قوانین کے ہر ضابطے کی رُو سے مسلمان ایک جُدا گانہ قوم ہیں ۔ ایک موقع پر کسی صحافی نے جب ان سے کہا کہ ایک وقت تھا جب آپ کانگریس میں شامل تھے تو قائدِ اعظمؒ نے اس طنز پر برجستہ جواب دیا تھا کہ جی ہاں! ایک وقت وہ بھی تھا کہ میں پرائمری جماعت کا طالب علم تھا۔ قائدِ اعظمؒ کسی تعصب کی بناء پر نہیں بلکہ ادراک اور شعور کے تمام تقاضوں کے تحت اس حقیقت کے قائل ہُوئے تھے کہ انسانوں کے درمیان ایمان کا رشتہ دیگر تمام رشتوں سے زیادہ مستحکم، مضبوط اور بلند ہے ۔

مارچ 44ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے کہا: ” مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد نہ وطن ہے نہ نسل بلکہ کلمہ توحید ہے ۔ ہندوستان کا پہلا فرد جب مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جُدا گانہ قوم کا فرد ہو گیا ۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی ۔“ قائدِ اعظمؒ نے مزید فرمایا: ” آپ نے غور کیا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبہ محرکہ کیا ہے؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے؟ اس کی بنیادی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چالبازیاں ، بلکہ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے ۔“ اور یہی حقیقت بھی تھی ۔ انگریزوں کی منافقانہ حکمتِ عملی اور ہندوؤں کے تعصب نے ہمیں الگ قوم نہیں بنایا بلکہ مسلمان کی حیثیت سے ہم ایک الگ تشخص رکھتے ہیں ۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے رویّے نے اس جُدا گانہ تشخص کے شعور کو بیدار کیا۔ اگر ہم الگ قوم نہ ہوتے تو پاکستان حاصل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے ۔ اسلام اور ہندو دھرم محض مذاہب ہی نہیں بلکہ درحقیقت دو مختلف معاشرتی نظام ہیں اور یہ بات ممکن ہی نہیں تھی کہ یہ دونوں معاشرتی نظام اپنی امتیازی صفات برقرار رکھتے ہُوئے ایک مشترکہ قومیّت کی تشکیل کر لیتے ۔ بین الاقوامی کہاوت کی رُو سے اس وقت بھی ہندوستان میں ایک قوم آباد ہے! ”ہندوستانی قوم“ لیکن حقیقت حال کیا ہے؟ اسے ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں ۔ خود پاکستان میں قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی فتنہ

پر دازوں نے علاقائی اورلسانی تعصّبات پھیلائے اور پاکستان میں مسلمانوں کو ورغلا کر گروہوں میں تقسیم کر دیا، لیکن اس سے کون سا تعمیری نتیجہ برآمد ہُوا، اس سے ہمیں خسارے کے سوا اور کیا حاصل ہُوا؟

قائدِاعظمؒ نے 17 ستمبر 44ء کو بمبئی میں گاندھی سے اپنی ملاقات کے دوران گاندھی کو ایک خط میں لکھا تھا: ''ہم مسلمان اپنی تابندہ تہذیب اور تمدّن کے لحاظ سے ایک قوم ہیں۔ زبان وادب، فنونِ لطیفہ، فنِ تعمیر، نام ونسب، شعور اقدار وتناسب، قانون واخلاق، رسم ورواج، تاریخ وروایات اور رُجحان ومقاصد، ہر لحاظ سے ہمارا انفرادی زاویہ نظر اور فلسفہ حیات ہے۔ بین الاقوامی قوانین کی ہر تعریف کی رُو سے ہم ایک قوم ہیں۔''

قائدِاعظمؒ کے ان الفاظ پر غور کیجئے اور بتائیے کہ اس میں کون سی بات غلط ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ زندگی کے ہر شعوری عمل کے سلسلے میں ہمارا اپنا ایک الگ زاویۂ فکر اور طرزِ عمل ہے۔ ہم صرف عبادت نہیں کرتے بلکہ ہم حقیقت میں خدائے واحد کے آگے سربسجود ہو کر دیگر تمام باطل ''قوتوں'' کو مسترد کر دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا آخری نبیؐ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرنے یا اس پر ایمان لانے والوں کو خارج از اسلام سمجھنا ہی ہمارا ایمان ہے۔ یہ ہماری زندگی کے تمام افکار اور تمام اعمال کو دنیا کے دیگر تمام انسانوں کے افکار واعمال سے ممتاز ومنفرد کر دیتا ہے۔

اس وقت پاکستان میں ہم کن مصائب میں گرفتار ہیں اور ہم ہی نہیں، سارا عالمِ اسلام اس وقت کن آزمائشوں سے گزر رہا ہے؟ اس پر بھی اگر غور کیجئے تو اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ہم اپنے اسلامی تشخص کی بناء پر دوسری قوموں کے ساتھ تعصب برتتے ہیں۔ اسلام کا تو تعصّبات سے دُور کا بھی واسطہ ورشتہ نہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے تشخص کی اس توانائی سے محروم ہو گئے ہیں جس نے صرف پچاس برس قبل ہمیں ایک نئی مملکت کا وارث بنایا تھا اور اس کامیابی میں قیادت کی صداقت ودیانت اور عزم واستحکام کا بڑا دخل تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی شخصیت وحدتِ ملّی کی علامت بن گئی۔ان کی قیادت میں ہماری صدیوں کی عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے امکانات روشن ہو گئے۔ان کی قیادت نے قوم میں خودشناسی کا جوہر پیدا کر دیا۔ان کی گفتار کی صداقت اور کردار کے جمال اورعزم نے ہمیں ''ایمان، اتحاداورتنظیم'' کے معانی سمجھا دیئے۔ان کی قیادت میں ہماری بہت سی اعلیٰ اجتماعی صفات بیدار ہو گئی تھیں۔ایک زمانہ ہمیں حیرت سے دیکھنے لگا تھا کہ یہ کیسی قوم ہے اور یہ کیسا قائد ہے جو نہ مخالف کی قوت سے گھبراتا ہے، نہ اس کی تعداد سے۔نہ منزل کی دشواریوں سے دل شکستہ ہوتا ہے، نہ راہ کے خطرات سے۔نہ اسے دھوکہ دیا جاسکتا ہے، نہ خوفزدہ کیا جاسکتا ہے۔نہ اسے لالچ دیا جاسکتا ہے اور نہ خریدا جاسکتا ہے۔

ظاہری وضع قطع کے خودساختہ اصولوں کو اسلام کی بنیاد قرار دے کر ہم جو چاہیں کہہ دیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کی فکر وعمل ان تمام اصولوں کی خوشبو میں رچے بسے تھے جنہیں اسلام نے انسانیت کی فلاح کے لئے لازمی قرار دیا ہے۔قائدِ اعظمؒ نے بیسویں صدی میں نہایت کامیاب سیاستدان ہونے کے حوالے سے بلند کرداری، دیانت اور صداقت کا دامن ہاتھوں سے کبھی نہیں چھوڑا۔انہوں نے ثابت کیا کہ دھوکہ اور فریب کے بغیر سیاست میں بھرپور کامیابی ممکن ہے۔یہ عمل بجائے خود جہاد ہے جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں پر مستحکم یقین کے بغیر کامیابی حاصل نہیں ہوسکتی!

*****

تحریکِ پاکستان کے غیر معروف گوشے

ایم اے ایچ اصفہانی

...•••...

1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت پہلے عام انتخابات کے بعد از سرِ نو توانا مسلم لیگ کا پہلا عظیم الشان اجلاس 15 سے 18 اکتوبر 37ء تک لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کی شان و شکوہ اور اس کے لیے جو پُرتکلف انتظامات کئے گئے تھے، ان کا سہرا راجہ صاحب محمود آباد کے سر ہے۔ اپنے قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور اُن کے سرکردہ ساتھیوں کی تقریریں سننے کے لیے پچاس ہزار سے زائد لوگ جمع تھے۔

قائدِ اعظمؒ اپنے پرانے دوست مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد کی قیام گاہ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں مقیم تھے۔ پہلے روز کے جلسۂ عام کے شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے راجہ صاحب، چوہدری خلیق الزماں اور میں قائدِ اعظمؒ کی قیام گاہ میں اس دن کے پروگرام پر نظر ڈالنے کی غرض سے جمع تھے کہ نواب اسماعیل خاں بھی اسی دیوان خانہ نما برآمدے میں ہمارے ساتھ آ ملے۔ وہ حسبِ معمول بالکل بے عیب لباس میں ملبوس تھے اور ایک سیاہ سموری ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

قائدِ اعظمؒ نواب صاحب کی اس ٹوپی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے اپنی ٹوپی دے سکتے ہیں۔ نواب صاحب نے انتہائی خوش دلی سے ٹوپی مسٹر جناح کو دے دی اور ان سے اُسے پہننے کی درخواست کی، صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ان پر یہ کیسی لگتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ قائدِ اعظمؒ نے اسے پہن لیا اور جب اُنہوں نے دیکھا کہ ہم لوگ اس ٹوپی کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ اُٹھ کر ساتھ کی خواب گاہ میں چلے گئے اور وہاں ایک قدِ آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر ہماری رائے کا محاسبہ کرنے لگے کہ ٹوپی نہ صرف ان کے ٹھیک آئی بلکہ ان کو زیب بھی دیتی تھی۔

دومنٹ کے بعد برآمدے میں واپس آئے تو کسی نے تجویز دی کہ وہ یہ ٹوپی پہنے رہیں اور اسی طرح اجلاس میں جائیں۔ اُنہوں نے یہ تجویز مان لی اور ہم سب جلسے میں چلے گئے۔ مجھے وہ مجمع ابھی تک یاد ہے۔ مجھے لوگوں کے مسکراتے ہوئے چہرے اب تک نظر آتے ہیں اور وہ زوروشور کی تالیاں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے جو قائدِ اعظمؒ کے داخل ہوتے وقت پنڈال کی فضا میں گونج اُٹھے، اب بھی سنائی دیتے ہیں۔ ڈائس اور دریوں پر جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے، وہ سب کے سب اس ٹوپی اور شیروانی کی جسے قائدِ اعظمؒ ایسی کسی تقریب میں پہلی مرتبہ زیب تن کیے ہُوئے تھے، تحسین و آفرین کرنے لگے۔ اس سے انھیں خود بھی اتنی ہی خوشی و مسرت ہُوئی جتنی ہم سب کو۔

لکھنؤ کا اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی شہر کے بہت سے نوجوان اور معمر لوگوں نے یہ ٹوپی پہننا شروع کر دی جو قائدِ اعظمؒ کی بدولت راتوں رات مقبول ہو گئی تھی۔ ٹوپیاں بنانے والے بھی اس مقبولیت سے فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے مختلف حیثیتوں کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ٹوپیاں بنانا شروع کر دیں۔ ہندوستان کی مسلم قوم نے بہت ہی قلیل عرصے میں یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ چنانچہ مدورا کے مسلمانوں میں بھی یہ ایسی ہی مقبول ہوئی جیسی کہ مردان کے مسلمانوں میں اور اس وقت سے آج تک یہی جناح کیپ بطور پاکستانی لباس کا حصہّ ہے۔

ہمارا پرچم

3 جون 1947ء کے ماؤنٹ بیٹن کے اعلان کے فوراً ہی بعد قائدِ اعظمؒ نے قابل اور ممتاز مسلم لیگیوں کو کام پر لگا دیا۔ اُن میں سے کچھ نے تو ہمارے اور ہندوستان کے درمیان اثاثے کی تقسیم پر کام شروع کیا، کچھ نے تقسیمِ ملک پر اور بعض دوسروں نے ایک خودمختار ملک کی فوری ضروریات پر۔ پاکستان نے اب اپنی آزادی حاصل کر لی تھی اور اسے ایک ایسے قومی پرچم کی ضرورت تھی جو برطانوی علامات سے بالکل پاک صاف ہو۔ اس جھنڈے کے لئے کئی مختلف

نمونے پیش کئے گئے اور آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ ڈنڈے کے پاس جھنڈے کا ایک چوتھائی حصّہ سفید ہو اور جہاں سے سفید رنگ ختم ہو وہاں سے باقی تین چوتھائی سبز اور سبز حصے میں ایک ہلال اور ستارہ ہو، اس طرح کہ وہ ڈنڈے سے 45 درجے کا زاویہ بنائے اور اس کا رُخ ڈنڈے سے دوسری طرف ہو۔ سبز مسلم لیگ کے جھنڈے کا رنگ تھا اور ہلال و ستارہ بھی اس کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ مسلم لیگی جھنڈے کا ہلال اور ستارہ ایک مختلف زاویہ بناتا تھا۔ جھنڈے کا سفید رنگ پاکستان کی اقلیتوں کی علامت تھا جن کی مجموعی تعداد تقسیم کے وقت آبادی کے ایک چوتھائی حصے سے بھی کم تھی۔

جب قومی پرچم پر اتفاق رائے ہو گیا تو حکم دیا گیا کہ 14 اگست کو پرچم کشائی کے لئے جھنڈے تیار رہیں۔ میں اپنے حافظے سے اس دن کی یاد محو نہیں کر سکتا جب 11 اگست کو کراچی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ایک ولولہ انگیز تقریر کرتے ہوئے اس جھنڈے کو منظوری کے لئے مجلس آئین ساز کے سامنے پیش کیا۔ جھنڈے کی وضع قطع بتانے کے بعد انہوں نے اس کی علامتی اہمیت پر ان الفاظ پر زور دیا:

صدرِ محترم یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارا جھنڈا کسی ایک سیاسی جماعت یا فرقے کا جھنڈا نہیں ہے۔ یہ جھنڈا پاکستانی قوم کا اور اس پاکستانی ریاست کا جھنڈا ہے جو 14 اگست کو وجود میں آ رہی ہے۔

"جناب والا! ہر ایک قوم کا جھنڈا محض کپڑے کا ایک ٹکڑا نہیں ہوتا۔ کپڑا بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ وہ اہم چیز ہوتی ہے جس کی یہ نمائندگی کرتا ہے اور میں بلاخوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ جھنڈا جس مجلس کے سامنے پیش کرنے کا مجھے شرف حاصل ہوا ہے، ان سب لوگوں کے لئے جو پاکستان کے جھنڈے کے وفادار ہیں، استقلال، آزادی اور مساوات کی علامت ہو گا (تالیاں) یہ جھنڈا ہر شہری کے جائز حقوق کی حفاظت کرے گا، یہ جھنڈا ملک کی سالمیت کے محافظت و حمایت کرے گا۔

"جناب صدر! مجھے اس میں ذرا سا بھی شبہ نہیں یہ جھنڈا دنیا کی تمام قوموں کی عزّت و تعظیم حاصل کر لے گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ایک دفعہ پاکستان قائم ہو گیا اور ہمیں سات کروڑ انسانوں کی قسمت سنوارنے کا موقع مل گیا تو ہم دنیا بھر کو یہ دکھا دیں گے کہ ہم نے ایک ایسا ملک بنایا ہے جو پاکستان کے سات کروڑ انسانوں کے شایانِ شان ہے جو عالمی تنظیموں میں اپنا کردار دیانتداری سے ادا کرے گا اور ایسا نہیں کہ دوسروں کے علاقے فتح کرنے کا خواہاں ہو۔"

جلسے کی صدارت قائدِ اعظمؒ کر رہے تھے۔ لیاقت علی خان کھڑے ہو کر اراکان کو جھنڈا دکھا رہے تھے تو قائدِ اعظمؒ کا چہرہ مشعل کی مانند روشن ہو گیا، اس سے اطمینان اور اس چیز کی شکرگزاری نمایاں تھی کہ ان کی زندگی میں آخر کار وہ دن آ گیا جب لوگ اپنا جھنڈا منتخب کرنے کے لئے آزاد ہو گئے۔ اِس وقت وہ ایسے نظر آ رہے تھے جیسے کوئی فنکار جسے اس کے کام پر سونے کا تمغہ ملا ہو یا جیسے کوئی فخر کرنے والا باپ جو تقسیمِ اعزازات کی کسی ایسی تقریب میں حاضر ہو جس میں اس کے بیٹے کو بہادری کا سب سے بڑا اعزاز ملنے والا ہو۔

تیزی سے گزرتے ہوئے وہ چند منٹ درحقیقت ہم سب کے لئے جذبات سے لبریز اور خوشی سے بھرپور لمحات تھے۔

میں نے واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے اور نیویارک میں پاکستانی قونصل جنرل کے لیے انہی نشان کا پرچم تیار کرایا جس پر ہلال وستارہ کا رخ دائیں (مشرق) کی جانب تھا اور اس کا وہی زاویہ تھا جو کہ قومی پرچم میں تھا۔ یہ نشان ہمارے دیگر سفارت خانوں میں بھی رائج ہو گیا۔ قائدِ اعظمؒ کی وفات کے تقریباً دو سال بعد ہمارے سفارت خانے کو دفتر خارجہ سے یہ ہدایت موصول ہُوئی کہ ہلال اور ستارہ کے نشان کا رخ بدل دیا جائے آئندہ ہلال کا رُخ مغرب یعنی جھنڈے کے بانس کی طرف ہونا چاہیے نہ کہ مشرق کی جانب جیسے کے ہمارے قومی جھنڈے میں تھا۔ بعد میں اس سلسلے میں سفارتخانے اور ہمارے دفترِ امور خارجہ میں خط کتابت ہوتی رہی۔ ہمارا یہ نقطۂ نظر تھا کہ اس قسم کی تبدیلی غیر ضروری تھی کیونکہ ہلال اور ستارہ محض علامتی تھے اور ان

کے رخ کے بڑھتے یا گھٹتے چاند کا مفہوم نہیں پیدا ہوتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے کئی مثالیں دیں اور بالخصوص یہ بتایا کہ ترکی کے سرخ قومی جھنڈے کا ہلال اور ستارہ ایک مبالغہ آمیز خمار ہلال تھا، جو جھنڈے کے بالکل بیچ میں بانس کے متوازی بنا ہے۔ یقیناً اس وضع کے کسی ہلال نے کبھی آسمان کو مزّین نہ کیا ہوگا، نہ ہی ایسی خوبصورت شکل وصورت کا چمکدار ستارہ ہلال کے دونوں سروں کے بیچ میں جا گزیں ہوا ہوگا ورنہ ہی ہلال آسمان میں کبھی مقام و ہیئت کے اعتبار سے ایسا کامل و بے عیب نظر آیا ہوگا لیکن اس کے باوجود پٹر کی قومی جھنڈے کا جزو ہے اور صدیوں سے ایسا ہی چلا آتا ہے۔

وزارتِ خارجہ لیاقت علی خان کی زیرِ ہدایت اس تبدیلی پر اصرار کرنے کا عزم کر چکی تھی اور کسی قسم کے دلائل سننے کے لئے اپنا موقف بدلنے کیلئے تیار نہ تھی تاہم مجھے اس سے بہت اطمینان ہوا کہ حکومت وقت نے ہمارے قومی جھنڈے کے ہلال اور ستارہ کا رُخ بدلنے کے سلسلے میں اپنے نقطہ نظر سے ہر فیصلے کو منوانے کی ضد اور انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ مجلس آئین ساز نے یہ جھنڈا 14 اگست سے چند روز پہلے بلا کسی اعتراض کے قبول کر لیا تھا اور قائدِ اعظمؒ نے بھی اسے پسند کیا تھا۔ کچھ عرصے بعد واشنگٹن کے سفارت خانے کو حکم ملا کہ وہ لاک ہیڈ ایئر کرافٹ کارپوریشن کو ہدایت کرے کہ قومی جھنڈے کو جہازوں کی دُم پر اس طرح بنائے کہ اس کا رُخ مغرب کی سمت ہو لیکن اس سے پہلے کہ دوسرا ہوائی جہاز، اور ینٹ ایئر ویز کے لیے ایک اور نمو پر کانسٹی لیشن بن کر تیار ہو، حکومت نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اپنی ہدایات کے الفاظ کو یوں بدل دیا: '' جھنڈا دُم کی طرف اڑتا اور ہلال و ستارہ اسی ہیئت و وضع سے باقی ہیں جیسے کہ پاکستان کے جھنڈے میں ہے۔'' اس تبدیلی کے مطابق مہروں، سرکاری کاغذات اور دیگر دستاویزات کے نشانوں میں گھٹتے ہوئے ہلال سے بڑھتے ہوئے ہلال کو دکھایا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ 1955ء میں وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی وزارت نے نئے سرکاری نشان کو اختیار کر لیا جو ابھی تک حکومت کا نیا نشان ہے۔

پاکستان کادارالحکومت

اس سوال پر کئی روز تک بحث رہی کہ پاکستان کا دارالحکومت کہاں ہو۔مختلف شہروں مثلاً لاہور، پشاور، راولپنڈی، کوئٹہ اور کراچی کا انتخاب کرنے میں جو فوائد یا نقصانات ہو سکتے تھے ان پر احتیاط سے غور کرنے کے بعد قائدِاعظمؒ اور ان کی مجلسِ عاملہ نے اس پر اتفاق کیا کہ اس کے لئے مناسب ترین مقام لاہور تھا، لیکن چونکہ یہ ہندوستانی سرحد سے بہت قریب تھا اور اس زمانے میں صوبہ پنجاب کے دارالحکومت کا کام دے رہا تھا، اُسے منتخب کرنا مناسب نہ ہوگا۔ راولپنڈی اور اس کے گرد نواح کے مقامات کو اس لئے خارج از بحث قرار دیا گیا کہ برطانوی حکومت کی تحقیقات سے جو بہت مکمل طریقے پر اور کافی روپیہ صرف کر کے کی گئی تھی، یہ ظاہر ہوا تھا کہ اس علاقے میں کسی معقول پیمانے پر اضافے کے لئے پانی کی کمی تھی۔اسی لئے حیدرآباد، پشاور اور کوئٹہ پر غور نہیں کیا گیا۔

قائدِاعظمؒ کی رہنمائی میں اتفاقِ رائے ہوا کہ اس عزت کے لئے موزوں ترین شہر کراچی تھا لیکن راستے میں ایک رکاوٹ تھی جسے پہلے دور کرنا تھا۔سندھ کا صوبائی دارالحکومت بھی کراچی میں تھا اور اس طرح یہ شہر بیک وقت قومی اور صوبائی دارالحکومت نہیں بن سکتا تھا۔صوبے کے اس وقت کے وزیرِاعلیٰ مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ کو طلب کیا گیا۔قائدِاعظمؒ اور لیاقت علی خان نے ان سے مجلسِ عاملہ کی تجویز پر بحث کی۔ان سے کہا گیا کہ اگر وہ ہماری یہ درخواست منظور کر لیں کہ سندھ کے دارالحکومت کو کراچی سے باہر مثلاً حیدرآباد منتقل کر دیں تو مرکزی حکومت مستقل طور پر کراچی میں آ جائے گی اور ان تعمیری اخراجات کا ایک بڑا حصہ اپنے پاس سے دے گی جو حکومتِ سندھ کی مجلسِ قانون ساز، عدالتوں، دیگر دفاتر کی عمارتوں اور اپنے عملے کے آدمیوں کے لئے رہائشی مکانات بنانے میں برداشت کرنا پڑیں گے۔وزیرِاعلیٰ نے تجویز کو ہمدردی سے سُنا اور اُسے مان لیا۔وہ دارالحکومت بدلنے پر رضامند ہو گئے اور انہوں نے کراچی سے منتقل ہونے کے لئے ایک سال کی مہلت مانگی تا کہ حیدرآباد میں موزوں اور مناسب عمارتیں بنانے کے لئے

کافی وقت مل سکے۔ اسے قائدِ اعظمؒ نے منظور کرلیا، کیونکہ ان کے نزدیک مغربی پاکستان میں مرکزی دارالحکومت کے لئے کراچی سے بہتر اور کوئی شہر نہ تھا۔ مرکزی حکومت کے کراچی آجانے کے کچھ عرصے بعد تک سندھ کی حکومت شہر کے نیپئر بیرک والے حصوں میں کام چلاتی رہی اور موجودہ تاریخ سے کچھ دیر بعد اپنے پرانے دارالحکومت کو چھوڑ کر حیدرآباد چلی گئی۔

سندھ کے بعض سیاست دانوں نے قومی دارالحکومت کے قیام کی خاطر کراچی اور بعض ملحقہ علاقوں کو صوبے سے الگ کر دینے کے خلاف احتجاج کیا اور یہ اندیشہ ظاہر کیا گیا کہ اس سے سندھ کو نقصان پہنچے گا، لیکن جب اس سلسلہ میں سندھی رہنماؤں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ سے کوئٹہ میں ملاقات کی تو انہوں نے حسبِ معمول ان پر پوری صورت حال ایسے قائل کُن انداز میں واضح کر دی کہ ان کو اطمینان ہو گیا۔ اُن کے اندیشے دُور ہو گئے۔ بے چینی کا خاتمہ ہو گیا اور کراچی کئی برس پاکستان کا دارالحکومت رہا۔

*****

منزلِ آزادی کا سیدھا راستہ

مسعود جاوید ہمدانی

...•••...

پاکستان میں ہر سال چودہ اگست اور ستائیس رمضان المبارک کے حوالے سے قومی سطح پر جو اظہار تشکر و امتنان ہوتا ہے یا چھ ستمبر کی مناسبت سے بھارتی جارحیت کے خلاف پاکستانی قوم کے جذبۂ جہاد اور عسکری کارناموں پر فخر و مباہات کی جو باتیں ہوتی ہیں، ان کے پس منظر میں بہر حال وہی نظریہ کارفرما ہوتا ہے جو قیام پاکستان کا جذبۂ محرکہ تھا۔ اس نظریۂ حیات نے ہی بڑ صغیر میں مسلمانوں کو علیحدہ تشخص عطا کیا تھا اور اسی نظریاتی تشخص نے انہیں بطور قوم زندہ رکھا، وگرنہ انگریز کی مسلم مخالف قوتِ حاکمہ اور ہندو اکثریت کا ظالمانہ تعصب مسلمانوں کے بطور قوم علیحدہ وجود اور ان کی سیاسی قوت کو معدوم کر چکے ہوتے۔

مذکورہ بالا جذبۂ محرکہ یا نظریۂ حیات کیا تھا؟ یقیناً نظریۂ حیات صرف اور صرف اسلام تھا۔ دو قومی نظریہ کو مسلمانوں کی علیحدہ اسلامی مملکت کی تشکیل کے لئے جذبۂ محرکہ بنانے میں علامہ اقبالؒ کی شخصیت اور فکر نے بہت ہی مؤثر کردار ادا کیا۔ انہوں نے 1930ء میں مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ الہ آباد میں خطبہ دیتے ہوئے اس نظریہ کے حوالے سے بڑ صغیر میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کی بقاء اور دینی تقاضوں کی تعمیل کے لئے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل ایک الگ اسلامی مملکت کی تشکیل کی واضح نشاندہی کر دی اور یوں مسلمانوں کو ایک سیاسی نصب العین دے کر متحرک کر دیا۔ اس سیاسی نصب العین کی تکمیل کے لئے موزوں اور باصلاحیت سیاسی قیادت کی بھی ضرورت تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اس ضمن میں عظیم مفکر کی حیثیت میں محمد علی جناحؒ کی نشاندہی کر دی اور انہیں قائل کر کے انگلستان سے ہندوستان واپسی پر آمادہ کیا۔ یہ علامہ اقبالؒ کا

ذاتی ایثار بھی تھا کیونکہ وہ برِ صغیر کے مسلمانوں کے ایک مُسلّمہ فکری رہنما تھے اور قوم اِن کا دلی احترام کرتی تھی۔ وہ خود بھی قابلِ قبول سیاسی رہنما بن سکتے تھے لیکن انہوں نے بےلوثی کا مظاہرہ کرتے ہوئے محمد علی جناحؒ کو موزوں خیال کیا اور محمد علی جناحؒ نے بھی مسلمانوں کے فکری رہنما کے ارشاد کی تعمیل پر آمادگی ظاہر کر کے خلوصِ نیت کا ثبوت بہم پہنچا دیا۔ علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے اپنی اپنی جگہ پر خود غرضی سے پاک ہونے کے وصف نے ان میں حق گوئی اور اخلاص کی وہ قوت پیدا کر دی تھی جو کسی بھی نصب العین کی تکمیل اور کسی بھی تحریک کی کامیابی کے لئے بنیادی اور اوّلیں تقاضا ہوتی ہے۔ ان دونوں شخصیتوں کی بےلوثی، خالص نیت اور جذبۂ ایثار نے مسلمانوں کو متحرک کر کے برِ صغیر میں ایک ایسا سیاسی انقلاب برپا کر دیا جو مسلمانوں کی کثیر تعداد کو ہندوؤں کی سیاسی و اقتصادی غلامی سے نجات دلانے اور ایک نئی اسلامی مملکت ۔۔پاکستان۔۔ کے قیام پر منتج ہوا۔ ہندو کانگریس اور انگریز حکمران اس دوران مسلمانوں کے اسلامی تشخص اور علیحدہ قومی وجود کو فنا کرنے کے لئے فکری و عملی تدابیر بروئے عمل لاتے رہے۔

وہ جغرافیائی وحدت کے حوالے سے برِ صغیر کی ساری آبادی کو واحد قوم قرار دے کر متحدہ قومیت کے غیر فطری نظریہ کو قابلِ قبول بنانے میں کوشاں رہے، ہندوستان پر انگریزوں کی یلغار کے دوران برِ صغیر کی حکمران قوم مسلمانوں کے خلاف انگریز کی مدد اور استقبال کر کے ہندو خود اس طرح کی متحدہ قومیت کی نفی کر چکی تھی۔ اِسی طرح انگریز بھی مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کی مدد حاصل کر کے متحدہ قومیت کی نفی کر چکے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی فکری رہنمائی اور قائدِ اعظمؒ کی عملی سیاسی قیادت کے زیرِ اثر مسلمانوں کی عظیم اکثریت نے ہندو کانگریس کے غیر فطری نظریہ قومیت کو مسترد کر دیا۔

مسلمانوں کی بھاری اکثریت سے متخالف بعض علماء ہندو کانگریس اور انگریز کے فریب میں آ کر قرآن مجید کے دو قومی نظریہ کے مقابلے میں متحدہ قومیت کے نظریہ کے حامی اور مبلغ بن گئے تھے۔ انہیں مسلمانوں نے کانگریسی علماء کے خطاب سے یاد کیا۔

ہندو کانگریس مشترکہ زبان کے حوالے سے اپنے نظریہ قومیت کو تقویت دے سکتی تھی لیکن وہ ایسا کرنے سے بھی قاصر رہی کیونکہ برِ صغیر میں متعدد لسانی جغرافیائی اکائیاں موجود تھیں۔ اِن اکائیوں کو متحد کرنے کے لئے ایسی زبان کو اختیار کرنا ضروری تھا جسے برِ صغیر کی تمام لسانی اکائیوں میں سمجھا اور بولا جاسکتا۔ ہندی کو یہ درجہ حاصل نہ تھا، سنسکرت تو ویسے بھی مُردہ زبان قرار پا چکی تھی۔ لسانی اکائیوں کو زبان کے حوالے سے متحدہ قومیت میں ڈھالنے کی صلاحیت صرف اور صرف اردو زبان میں ہوسکتی تھی کیونکہ یہ برِ صغیر میں موجود تمام لسانی اکائیوں کے باشندوں کے باہمی معاشرتی میل جول اور رابطے کی بدولت وجود میں آئی تھی اور اسے بطور مشترکہ زبان کے قبولِ عام کا درجہ بھی حاصل ہو چکا تھا، لیکن ہندو قیادت کو تو اردو زبان بھی قابلِ قبول نہ تھی۔ وہ اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر بالواسطہ اپنے علیحدہ قوم ہونے کی حقیقت کو قبول و منظور کر رہی تھی۔ ہندو قیادت کا یہ فکری تضاد بڑا نمایاں تھا لیکن کانگریسی علماء اسے سمجھنے سے قاصر رہے۔ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہ تھی کہ برِ صغیر میں وارد ہونے والے مسلمان فارسی دان تھے۔ وہ اپنے ساتھ فارسی زبان لائے تھے یا پھر کسی حد تک عربی کہ یہ ان کے دینی علوم کا بنیادی ذریعۂ ابلاغ تھی۔ اردو زبان برِ صغیر کے سوا کسی دوسرے مسلم ملک کی بھی زبان نہ تھی۔ اس نے فارسی دان مسلمانوں اور مقامی ہندو آبادی کے لسانی میل جول کے نتیجے میں پرورش پائی تھی۔ یہ مقامی زبان کے صرفی و نحوی قواعد پر متشکل ہوئی اور اس کی تشکیل و ارتقاء میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کا بھی مساوی حصہ تھا۔ عجیب تضاد ہے کہ مشترکہ زبان کو مسترد کر کے بھی مسلمانوں سے متحدہ قومیت میں ضم ہونے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

اگر ہندو قیادت کو اردو زبان قبول نہ تھی تو وہ مسلمانوں کے علیحدہ نظریۂ حیات اور ثقافتی عوامل و مظاہر کو کیونکر برداشت کرسکتی تھی۔ حقیقت صرف یہ تھی کہ وہ متحدہ قومیت کا فریب دے کر مستقبل میں اپنی اکثریت کی بدولت حاصل کردہ قوتِ حاکمہ کے ذریعے مسلمانوں کے علیحدہ قومی تشخص اور آخر کار اس کے وجود کو فنا کرنے کی منصوبہ بندی کر چکی تھی۔ اسے تو مسلمانوں کی

ہزار سالہ حکومت کا انتقام لینا مطلوب تھا۔اس وقت کی مسلمان قیادت کا یہ نہایت عظیم کارنامہ ہے کہ اس نے حالات کا درست تجزیہ کر کے درست نتائج اخذ کئے اور قیام پاکستان کو اپنا نصب العین بنا کر ان تمام مہلک امکانات کی پیش بندی کر دی جو سارے برصغیر پر ہندو اکثریت کے سیاسی غلبے اور حاکمیت کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے تھے۔پاکستان کا قیام دو متضاد نظاموں کی حامل قوموں کو جغرافیائی وحدت کے حوالے سے ایک قوم قرار دینے کے کافرانہ نظریئے کے استرداد کے نتیجے میں ممکن ہوا۔یہ انگریز کے گھڑے ہوئے سیاسی نظریات کی نفی کا ثبوت بھی بنا۔

جب ہندوستان کے مسلم اکثریتی علاقوں پر مشتمل پاکستان کی جغرافیائی حدود کا تعین کیا جارہا تھا تو ہندو انگریز تعصب نے گورداسپور کے ضلع کو مسلمانوں کے اکثریتی تناسب کے باوجود بھارت میں شامل کر دیا اور یوں بھارتی افواج کے لئے مسلم ریاست کشمیر میں مداخلت کی راہ پیدا کر دی۔کشمیر میں بھارت کی فوجی مداخلت نے ہی مسئلہ کشمیر پیدا کیا جو آج بھی خطہ میں امن وسلامتی اور فلاح وترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔کشمیر میں مسلمانوں پر بھارتی افواج کے مظالم آخر کس نظریاتی اخلاق کا نتیجہ ہیں؟

اہل پاکستان کو اس کا بخوبی اندازہ ہونا چاہیے۔جب پاکستان بن چکا تو متعصّب ہندو قیادت نے بھارتی پنجاب، صوبہ بہار اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا تقریباً پندرہ لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ان کی جائیدادیں اور عصمتیں لوٹی گئیں۔یہ تھی ہندو قیادت کے متحدہ قومیت کے تصور کی عملی تعبیر! آنے والے برسوں میں ہندوستان بھر میں ہزاروں مسلم کش فسادات میں مزید لاکھوں مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔صرف اس لئے کہ وہ دین اسلام کے پیروکار تھے۔برصغیر میں مسلمانوں کی یہ عظیم جانی اور مالی قربانیاں اسلام کے حوالے سے ہی تھیں۔ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلام کے نام پر ملک حاصل کرنے اور اسلام کے نام پر یہ عظیم قربانیاں پیش کرنے کے بعد پاکستانی قوم اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں میں بطور قوت متحرکہ

بروئے عمل لاکران فضائل اور ثمرات کی مستحق بنتی جن کی نشاندہی خالقِ کائنات نے قرآن میں کی ہے اور جس کا عملی ثبوت قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی اور علمی وفکری تغلب کی شکل میں تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔

قیامِ پاکستان کی تحریک کے دوران ہماری قوت کا سرچشمہ اسلام تھا۔قیامِ پاکستان کے بعد اعمال کے انفرادی اور قومی دائروں میں اسلام ہی ہمارے لئے قوتِ متحرکہ ہونا چاہیے تھا لیکن قیامِ پاکستان سے اب تک پاکستان کی مسلمان قوم نے کیا اس اوّلیں اور بنیادی تقاضے کو پورا کیا؟اس سوال کے درست جواب میں اور اس جواب کی روشنی میں دیانتدارانہ خود احتسابی،نیز تحریکِ پاکستان کے جذبۂ محرکہ کی بازیابی اور احیاء میں ہی ہماری قومی فلاح اور عاقبت کی نجات مضمر ہے۔

*****

قائدِ اعظمؒ کے پاکستان کی سچی تصویر

محمد سلیم ساقی

...•••...

سیکولرازم (دہریت، لادینیت) اور تھیوکریسی (پاپائیت، مُلائیت) خالصتاً مغربی اصطلاحیں ہیں ۔مغربی دنیا میں مذہب کو ایک پرائیویٹ اور ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے ۔دراصل یہودیت ونصرانیت نامکمل مذاہب ہیں ۔ان کی مذہبی آسمانی کتب (توریت وانجیل) شروع سے ہی غیر محفوظ ہیں ۔ان کے اصول وضوابط بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہیں ۔ان کے راہبوں نے دل کھول کر ان میں من پسند ترامیم کیں ۔اس لئے ان کا مذہب تھیوکریسی کی صورت اختیار کر گیا ۔راہبوں اور پادریوں نے اپنے اقوال کو وحی اور الہام کی صورت دے کر اپنے ذاتی خیالات کو لوگوں پر مسلط کرنے کی کوششیں کیں ۔آخر کار اس فریب کا پول کھل گیا ۔چونکہ ان کے خیالات زیادہ تر صحیح فطرت، عقلِ سلیم، استدلال اور سائنس کی بنیادی حقیقتوں کے خلاف تھے، اس لئے مذہب کو تھیوکریسی قرار دے کر ان کے خلاف یکے بعد دیگرے بغاوتیں پیدا ہوتی رہیں ۔ اس دوران بادشاہ بھی اپنا خودساختہ آسمانی حق DIVINE RIGHT OF KING سمجھ کر رعایا کا خون نچوڑتے تھے اور عیش پرستی کرتے تھے ۔ان کو پوچھنے والا کوئی نہ تھا ۔اس کے ردِعمل میں جدید دنیا مذہب کو ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھ کر اپنے معاملات سیکولرازم اور لادینیت کی بنیاد پر طے کرنے لگی ۔ فرانسیسی مفکرین والٹیئر (1694ء۔1778ء) اور روسو (1712ء۔1778ء) نے لوگوں میں بیداری پیدا کر کے انقلاب کو کامیاب بنانے میں مدد دی ۔انگلستان کی تحریک اصلاح (ریفارمیشن) اور اس سے پہلے یورپ میں نشاۃِ ثانیہ نے سائنس دانوں اور مفکروں کے اندر تحقیق پسندی، عقل پرستی اور سائنسی انداز کی تخلیق کر کے مذہب

کی مسلمہ روایات کو چیلنج کیا۔ان تمام عوامل نے انقلاب فرانس پر گہرے اثرات ڈالے۔ بادشاہوں کے خودساختہ حقِ آسمانی کو عقل وفکر کی کسوٹی پر پرکھا جانے لگا۔خدا، وحی، الہام وغیرہ کو تھیوکریسی کی تخلیق قرار دے کرانہیں غیر ضروری سمجھا گیا۔اجتماعی زندگی کی تشکیل اورزندگی کے دیگر سارے معاملات مذہب کی رہنمائی سے خارج قرار دے دیئے گئے۔عیسائیت اوریہودیت کی تھیوکریسی کی صورت اس لئے قائم رہی کہ ایک تو خاص دَور کے لئے آئے ہوئے مذہب کو انہوں نے دائمی شکل دی، دوم یہ کہ بنیادی کتب صحیح شکل میں قائم نہ رہ سکیں۔ان دووجوہات کی بنا پر انسانیت صدیوں تک تھیوکریسی یعنی پوپوں، پادریوں اور پنڈتوں کے عذاب میں گرفتار رہی۔ بادشاہ کا حقِ آسمانی چھین لینے، پوپ کا ریاستی اُمور میں عمل دخل بند کردینے اور چرچ کو سیاست سے علیحدہ کردینے کے بعد سیکولر سٹیٹ وجود میں آئی۔

اسلام دین اور دنیا میں امتیاز قبول نہیں کرتا۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا محض ایک دوسرے سے وابستہ ہی نہیں بلکہ لازم وملزوم ہیں۔مسلمان پر دنیا میں رہ کر دینی اقدار کا تحفظ اور ان پر عمل ضروری ہے۔نصرانیت اور یہودیت کے برعکس اسلامی ہدایات (قرآن واحادیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محفوظ، کامل اورابدی ہیں۔اسلام کے اصول ہر دور کے حالات اور تقاضوں پر لاگو ہوتے ہیں۔وحی کا سلسلہ بند ہو جانے اور دین کے کامل ہو جانے کی بنا پر مسلمان کو اب دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

مزید برآں اسلامی ریاست میں مذہب کوئی پرائیویٹ معاملہ (ماسوائے چند ایک عبادات کے) نہیں بلکہ ریاست کا دستور، معیشت، معاشرت، سیاست، عدل وانصاف اور زندگی کے تمام معاملات دین اسلام کے تابع ہوتے ہیں۔تھیوکریسی کے برعکس اسلام نے اُمتِ مسلمہ کو تین اہم اور بنیادی اختیارات دیئے ہیں۔وہ یہ ہیں:

(1) اختیارِ حکمرانی

(2) اختیارِ وسائلِ معاش

(3) اختیارِ تعبیر قانونِ شریعت

اسلامی ریاست میں مذہبی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ اس میں ہر مذہبی اقلیت کو مذہبی، سیاسی اور معاشرتی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے لَا اِکراہَ فِی الدِّین (دین اسلام میں کوئی جبر نہیں) بشرطیکہ اقلیت ریاست کی وفادار رہے اور اسلام دشمن کارروائیوں میں حصہ نہ لے۔تھیوکریٹک سٹیٹ میں مذہبی اجارہ داری ہوتی ہے۔ مذہبی اقلیتوں سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

قائدِ اعظمؒ تھیوکریسی اور سیکولرازم دونوں کے انتہائی مخالف تھے۔پہلے تھیوکریسی کے بارے میں ان کے خیالات قلمبند کئے جائیں گے پھر سیکولرازم کی مخالفت میں ان کے جذبات و احساسات کا تذکرہ ہوگا۔ قائد اعظمؒ کو مذہب سے ناآشنا گردا ننے والے دیکھیں کہ وہ کس خوبصورت انداز میں تھیوکریسی، سیکولرازم اور اسلام میں تمیز کرتے ہیں اور پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا جذبہ رکھتے ہیں۔

پاکستان تھیوکریٹک سٹیٹ نہیں ہوگی

☆ "غلطی مت کھایئے۔ پاکستان تھیوکریسی یا اس سے ملتی جلتی چیز نہیں۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ ہم دوسرے مذاہب کے لوگوں سے رواداری کا سلوک کریں۔ہم ان تمام لوگوں کا خیر مقدم کرتے ہیں خواہ وہ کسی بھی مذہب، نسل یا فرقے سے تعلق رکھتے ہوں جو پاکستان کے سچے اور وفادار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے تیار اور آمادہ ہوں۔"

(نشری تقریر۔19فروری1948ء)

☆ "ہم کس چیز کے لئے لڑ رہے ہیں؟ ہمارا مقصد کیا ہے؟ وہ تھیاکریسی نہیں ہے اور نہ ہی تھیوکریٹک ریاست ہے۔ مذہب کے وجود سے کون انکار کرسکتا ہے۔ مذہب ہمیں بھی عزیز ہے۔ چنانچہ جب ہم مذہب کی بات کرتے ہیں تو دنیاوی (سیکولر) اشیا کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔لیکن اور چیزیں بھی ہیں جو زندگی کے لئے ازبس ضروری ہیں۔ مثلاً ہماری معاشرتی زندگی، معاشی زندگی، سیاسی زندگی۔بغیر سیاسی اقتدار کے آپ اپنے عقیدے یا

معاشی زندگی کی حفاظت کیسے کر سکیں گے؟''

(نوائے وقت ۔9 جولائی 1947ء)

پاکستان اسلامی فلاحی ریاست ہوگی

قائداعظمؒ پاکستان کو نہ تو سیکولر اور نہ ہی تھیوکریٹک سٹیٹ بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اسے ایک اسلامی ریاست بنانے کے خواہش مند تھے۔تھیوکریسی سے ناپسندیدگی کا اظہار ملاحظہ فرمانے کے بعد اب سیکولرزم کی مخالفت اور اسلامی ریاست کے قیام کے بارے میں ان کے واشگاف بیانات وتاثرات کا مطالعہ فرمائیں:

کسی سیکولر ریاست کے دو اصول ہوتے ہیں:

(1) حکومتِ وقت غیر مذہبی بنیادوں پر قائم سیاسی پارٹیوں کی ہی اجازت دیتی ہے۔ مذہبی پارٹیوں پر پابندی ہوتی ہے۔

(2) سیکولر ریاست جداگانہ انتخابات کی اجازت نہیں دیتی۔اس کے آئین کے تحت انتخابات ہمیشہ مخلوط ہوتے ہیں جن میں ہر مذہب اور فرقہ کے لوگ اکٹھے ووٹ دیتے ہیں۔اس میں اقلیتوں کا تصور نہیں ہوتا۔

قیامِ پاکستان کے بعد قائداعظمؒ نے یہ دونوں شرائط لاگو نہ ہونے دیں۔انہوں نے مذہبی اقلیتوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں مکمل آزادی کا یقین دلایا اور ان کے جداگانہ حقِ انتخاب کو تسلیم کیا۔قراردادِ مقاصد میں اقلیتوں کے حقوق پورا کرنے کی ضمانت دی گئی۔قائداعظمؒ آخری دم تک اس بات پر ڈٹے رہے کہ پاکستان کی حکمران جماعت (مسلم لیگ) مذہبی بنیادوں پر قائم رہے۔اس کے نام سے ''مسلم'' کا لفظ ہٹانے نہ دیا۔وہ سیکولرازم کے دونوں بنیادی اصولوں کے عملی طور پر سخت مخالف رہے۔''عوامی مسلم لیگ'' (شیخ مجیب الرحمن کی پارٹی) سے سیکولر ذہنیت کے لیڈروں نے ''مسلم'' کا لفظ حذف کر کے اس کا نام ''عوامی لیگ'' رکھ لیا تھا۔اپریل 1953ء میں پرانے مسلم لیگی سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے استعفے دے دیئے اور ہندو سرمایہ دار اس میں شامل ہو گئے۔

پاکستان: قائداعظمؒ کے ارشادات کی روشنی میں

☆ پاکستان کا ایک اِسلامی ریاست بنانے کے بارے میں قائداعظمؒ کے چند ارشادات ملاحظہ ہوں:

''میں ان لوگوں کی بات نہیں سمجھ سکا جو دیدہ دانستہ اور شرارت سے پراپیگنڈا کرتے رہتے ہیں کہ پاکستان کا دستور شریعت کی بنیاد پر نہیں بنایا جائے گا۔ اسلام کے اصول عام زندگی میں آج بھی اس طرح قابل اطلاق ہیں جس طرح تیرہ سو سال پہلے تھے۔ میں ایسے لوگوں کو جو بدقسمتی سے گمراہ ہو چکے ہیں، یہ صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ یہاں غیر مسلموں کو بھی کوئی خوف اور ڈر نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام اور اس کے نظریات نے ہمیں جمہوریت کا سبق دے رکھا ہے۔ ہر شخص سے انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ پھر کسی ایسی جمہوریت، مساوات اور آزادی سے خوف کیوں لاحق ہو جو انصاف، رواداری اور مساوی برتاؤ کے بلند ترین معیار پر قائم کی گئی ہو۔''

(خطاب کراچی بار ایسوسی ایشن، 25 جنوری 1948ء)

☆ ''پاکستان کا دستور ابھی بننا ہے اور یہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی بنائے گی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس دستور کی شکل وصورت کیا ہوگی لیکن اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ جمہوری نوعیت اور اسلام کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ہوگا۔ ان اصولوں کا اطلاق آج کی عملی زندگی پر بھی اسی طرح ہوسکتا ہے جس طرح تیرہ سو سال پہلے ہوا تھا۔ اسلام اور اس کے نظریات سے ہم نے جمہوریت کا سبق سیکھا ہے۔ اسلام نے ہمیں انسانی مساوات، انصاف اور ہر ایک سے رواداری کا درس دیا ہے۔ ہم ان عظیم الشان روایات کے وارث اور امین ہیں اور پاکستان کے آئندہ دستور کے معماروں کی حیثیت سے ہم اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے بخوبی واقف ہیں۔''

(امریکی نامہ نگار کو انٹرویو، فروری 1948ء)

☆ ''میرا ایمان ہے کہ ہماری نجات کا واحد ذریعہ ان زرّیں اصولوں پر مشتمل ضابطہ حیات پر

عمل کرنا ہے جو ہمارے عظیم، واضع قانون پیغمبر اسلام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے لئے قائم کر رکھا ہے۔ ہمیں اپنی جمہوریت کی بنیادیں سچے اسلامی اصولوں اور نظریوں پر رکھنی ہیں۔ ہمارے اللہ کا فرمان ہے کہ ریاست کے امور و مسائل کے بارے میں فیصلے باہمی مشوروں اور بحث و تمحیص سے کیا کرو۔''

(تقریر سبی دربار، 14 فروری 1948ء)

☆ ''عملی طور پر پاکستان ہی وہ واحد مقصد ہے جس کے ذریعے آپ ہندوستان میں اسلام کو فنا ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ پاکستان موجود تو ہے لیکن اسے حاصل کرنا ہے۔''

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلباء سے خطاب، 10 مارچ 1941ء)

☆ ''مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں پر لازم ہے کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں۔ قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کرسکتی۔''

(3 نومبر 1939ء کو عیدالفطر کے موقع پر بمبئی کے مسلمانوں سے خطاب)

☆ ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ محض زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا بلکہ ہم یہاں ایک تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزار سکیں۔''

☆ ''اگر اسلامی حکومت قائم کرنے کیلئے ایک میز کے برابر بھی جگہ ملی تو مجھے قابل قبول ہوگی۔''

☆ 1943ء میں مسلم لیگ کے اجلاس دہلی کے بعد قائد اعظمؒ کی پریس کانفرنس میں ایک اخباری نمائندے نے سوال اٹھایا کہ کیا پاکستان میں اسلامی حکومت ہوگی؟ تو قائد اعظمؒ نے جواب دیا:

''قومی اسمبلی میں مسلمان نمائندوں کی اکثریت ہوگی۔ آپ ان سے کیا توقع رکھتے ہیں؟ کیا وہ غیر اسلامی قوانین نافذ کرنے کی جرأت بھی کرسکیں گے؟''

پاکستان میں سوشلزم راج کا خواب دیکھنے والے عناصر بانیٔ پاکستان پر بہتان باندھتے ہیں

کہ وہ سوشلزم کے حامی تھے۔قائدِاعظمؒ کے اقتصادی اور معاشی امور کے بارے میں بیانات کو توڑ مروڑ کر یہ ثابت کرنا چاہا گیا کہ وہ پاکستان میں سوشلسٹ معیشت لانا چاہتے تھے۔اس حوالے سے بھی قائدِاعظمؒ کے برملا اعلانات ملاحظہ فرمائیں۔

نظـــام اقتصـــاد

یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کی رسمِ افتتاح کے موقع پر قائدِاعظمؒ نے فرمایا:

''ہمیں اپنی تقدیر آپ بنانا ہےاور دنیا کے سامنےایک ایسا معاشی نظام پیش کرنا ہے جو اسلامی مساوات اور معاشرتی عدل کے سچے اسلامی اصولوں پر قائم ہو۔ایسا نظام پیش کر کے گویا ہم مسلمانوں کی حیثیت میں اپنا فرض انجام دیں گےاور اس طرح انسانیت کو امن کا پیغام دیں گے کیونکہ صرف ایسا امن ہی انسانیت کی نجات،اس کی فلاح،مسرت اور خوشحالی کا باعث بن سکتا ہے۔''

پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کا عزم نہ صرف بانیٔ پاکستان کا ہی خاصہ تھا بلکہ ان کے مخلص اور دیانتدار رفقائے کار بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔قائدِ ملّت خان لیاقت علی خان اس بارے میں مخلص تھے۔ان کی تحریک پر دستور ساز اسمبلی نے 12مارچ 1949ء کو قراردادِ مقاصد منظور کی۔اس قرارداد کو مرتب کرنے کی ذمہ داری علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کو سونپی گئی تھی۔

قائدِاعظمؒ نے مسلم لیگ کی قیادت سنبھالتے ہی دوقومی نظریہ کی روشنی میں پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کا عزم کر لیا تھا۔اپنی رحلت تک وہ اس پر قائم رہے۔وہ شعوری طور پر اسلامی نظام کو پاکستان میں لاگو کرنے کے حق میں تھے۔سیکولرازم،تھیوکریسی،مغربی جمہوریت اور سوشلزم کے نقائص کو اپنے ہمعصر علمائے کرام سے بھی کہیں زیادہ اچھی طرح سمجھتے تھے۔جب تک کسی بات یا اصول کو تہہِ دل سے قبول نہ کر لیتے،اس وقت تک اس کے حق میں بھول کر بھی کوئی حرف زبان پر نہ لاتے تھے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔یہ بات پتھر پہ لکیر ہے کہ بانیٔ پاکستان کے خمیر میں جھوٹ، دھوکہ دہی اور منافقت جیسے عناصر سرے سے موجود ہی نہیں

تھے۔ نہ انہوں نے انگریز اور ہندو سے منافقت کا کھیل کھیلا اور نہ ہی اپنی قوم سے کوئی جھوٹا وعدہ کیا۔ جسٹس لارڈ پیٹرک نے ان کی دیانتداری اور راست بازی سے متاثر ہو کر لکھا:

"ایسا کوئی مرد یا عورت اس دنیا میں نہیں جو اُن کی دیانتداری کے خلاف انگشت نمائی کر سکے۔ میرے واقف کار لوگوں میں وہ سب سے زیادہ راست باز تھے اور جہاں تک مجھے علم ہے انہوں نے ساری زندگی ایک لمحے کے لئے بھی کسی کو فریب دینے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کسی کو دھوکے میں نہیں رکھتے تھے۔ وہ ایک صاف شفاف آدمی تھے۔"

"دکھاوے، ریاکاری اور منافقت کو کس حد تک برا سمجھتے تھے، اس کی ایک لائق ستائش مثال ملاحظہ ہو۔ سیّد کاظم حسین شاہ آف گوجرانوالہ روزنامہ "جنگ" لاہور کے جمعہ میگزین 17 تا 23 فروری 1989 میں ایک روح پرور واقعہ قلمبند کرتے ہیں:

"1939ء میں شملہ آمد پر جلوس کے دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ وہ قائدِاعظمؒ کی عظمت کردار کا احساس دلاتا ہے۔ قائدِاعظمؒ رکشہ میں سوار تھے جسے لوگ رسے سے باندھ کر عقیدت کے طور پر کھینچ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا ہیٹ اتار کر گھٹنوں پر رکھا ہوا تھا۔ کسی نے ان سے درخواست کی کہ انگریزوں کی اس علامت کو مسلمان پسند نہیں کرتے۔ اس لئے وہ ہیٹ گھٹنوں سے اُٹھا کر پاؤں میں رکھ لیں اس طرح مسلمان خوش ہو جائیں گے۔ آپ نے گھٹنوں پر پڑا ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے فرمایا: "میں گاندھی کی طرح منافقت اختیار نہیں کروں گا۔"

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ عالم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا اور ان کو اپنے صحیح مقام سے روشناس کروایا تو قائدِاعظمؒ نے عمل، اخلاص اور قیادت کا وہ نمونہ پیش کیا کہ خلفائے راشدینؓ کی یاد تازہ کر کے رکھ دی۔ انگریز اور ہندو اس پیکرِ حمیت وغیرت کے آگے سر جھکا کر رہے۔ ان کے ہر قول، فعل سے اسلامی روایات میں اضافہ ہوا۔ جس بات کا عہد کیا، اسے پورا کر کے چھوڑا۔ قائدِاعظمؒ عملی مسلمان تھے اور اسلامیانِ ہند اور ملتِ اسلامیہ کا وقار بلند کرنے کا عزمِ مصمم رکھتے تھے۔ اسلامی آئین وضابطۂ حیات کو خوب سمجھتے تھے اور اسے ہر قسم کے ازم پر

فوقیت دیتے تھے۔ ''اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے'' کے لئے حاصل کی گئی ''تجربہ گاہ'' (پاکستان) میں سیکولرازم پر تجربہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن قرار دینے والا یہ قائد قوم سے کبھی دھوکہ نہیں کرسکتا تھا۔

29 جون 1947ء کو صوبہ سرحد کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:

''ان دونوں بھائیوں نے اپنے بیانات اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شوشہ چھوڑا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی۔ یہ بات قطعی طور پر غلط ہے۔''

(روزنامہ ''ڈان'' ،30 جون 1947ء)

قائدِ اعظمؒ نے پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کا وعدہ مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے نہ دیا تھا کہ وقت گزرنے پر دیکھا جائے گا بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی انہوں نے بار بار واشگاف الفاظ میں اس کا اعادہ کیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی ریاست ہی ہوگی۔ دراصل پاکستان بنتے ہی اسے مصائب و آلام نے گھیر لیا۔ معاشی بدحالی، ریڈکلف ایوارڈ کی ناانصافیاں، ہندوستان کی کشمیر پر چڑھائی اور مہاجرین کی آبادکاری جیسے مسائل نے موقع ہی نہ دیا کہ فوراً اسلامی دستور لاگو کر دیا جاتا بلکہ ورثہ میں ملے سیاسی، آئینی، معاشی وانتظامی نظام پر ہی وقتی طور پر اکتفا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں قائدِ اعظمؒ کی رُو بہ تنزل صحت بھی آڑے آئی۔ آپ نے بمشکل 9 ماہ کام کیا۔ ہنگامی بنیادوں پر ملک گیر دورے کئے۔ دستور کی تدوین متعلقہ ادارہ (دستور ساز اسمبلی جو 1946ء کے آل انڈیا انتخابات کے نتیجے میں ورثہ میں ملی تھی) کے سپرد کر دی جس نے قراردادِ مقاصد پاس کی۔ تیرہ ماہ بعد قوم اچانک اپنے اس قائد و محسن سے محروم ہو گئی۔ قوم اسلامی دستور و قوانین لاگو کروانے کے لئے آج بحث و مباحثے کا شکار ہے۔ اس خرابیٔ بسیار کا موردِ الزام قائدِ اعظمؒ کو ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟

جون 1948ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن سے خطاب کے دوران آئین و قانون کی بابت

ایک سوال کے جواب میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا تھا:

"میں کون ہوں آئین وقانون بنانے والا۔ ہمارا آئین وقانون آج سے تیرہ سو سال پہلے ہادیٔ برحق حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دے دیا تھا اور شریعت محمدی ﷺ نہ باسی ہوئی اور نہ بوسیدہ بلکہ اسی طرح تروتازہ ہے جیسی کہ تیرہ سو سال پہلے تھی۔ میں اس کے نفاذ، تعمیل اور اتباع کی کوشش کروں گا۔"

اپنی کئی تقریروں میں نظامِ اسلام کے نفاذ کے اعلانات کے باوجود قائدِاعظمؒ پیر آف مانکی شریفؒ اور پیر آف سیال شریف خواجہ حافظ محمد قمر الدینؒ سیالوی کو ذاتی خطوط کے ذریعہ نفاذِ اسلام کا یقین دلایا تھا۔ بقول مولانا عبدالستار خان نیازی یہ خطوط اب بھی آستانۂ عالیہ سیال شریف اور مانکی شریف موجود ہیں۔

ذیل میں ہم قائدِاعظمؒ کی دل دہلا دینے والی تقریر پیش کرتے ہیں جو انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کی تھی:

"مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا۔ شہرت اور ناموری کے بہت لطف اُٹھائے۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین لیکر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہے کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی اور مسلمانوں کی آزادی، تنظیم اور مدافعت میں اپنا فرض ادا کیا۔ میں آپ سے اس کی داد کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا اپنا دل، میرا اپنا ایمان، میرا اپنا ضمیر گواہی دے کہ جناح تم نے مدافعتِ اسلام کا حق ادا کر دیا۔ جناح تم مسلمانوں کی تنظیم، اتحاد اور حمایت کا فرض بجا لائے، میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبہ میں علمِ اسلام کو بلند رکھتے ہوئے مرے۔"

شاہدوں کا بیان ہے کہ قائدِاعظمؒ کے منہ سے یہ رقت آمیز الفاظ سن کر حاضرینِ مجلس زار زار رونے لگے۔ اس آرزو، عہد، عزم، خدا خوفی اور احساسِ ذمہ داری کے قربان جائیں! دل کی

اتھاہ گہرائیوں سے نکلے ہوئے یہ کلمات ایک پکے مسلمان کا ہی خاصہ ہو سکتے ہیں، کسی دہریئے اور دین نا آشنا شخص کو اس کی توفیق کہاں!

قائدِ اعظمؒ پاکستان میں خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ اجمعین کا نظام قائم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے جناب شریف الدین پیرزادہ سے علامہ شبلی نعمانیؒ کی معرکتہ آلاراء کتاب ''الفاروق'' کے دوسرے حصے کا جس میں حضرت فاروقِ اعظمؓ کے طرزِ حکومت کی تفصیل دی گئی ہے۔ انگریزی ترجمہ کرایا تھا اور مطالعہ کرنے کے بعد کہا تھا :

''میں پاکستان میں حضرت عمر فاروقِ اعظمؓ کا نظام لانا چاہتا ہوں۔''

(بیان سردار شوکت حیات، روزنامہ ''جنگ'' کراچی، صفحہ 03، 25 اگست 1985ء)

درج بالا حقائق کے باوجود قائدِ اعظمؒ کی نیت پر حملہ کرنے والے وہ لوگ ہیں جو اب بھی متحدہ قومیت اور وطنیت کے بت بغلوں میں لئے پھرتے ہیں۔ ملک کی نظریاتی سرحدوں پر وار کرنے والا یہ مخصوص طبقہ خود سیکولر ذہنیت کا حامل ہے۔ دو قومی نظریہ ماخوذ از قرآن و سنت کا انکار، مغربی جمہوریت کے حق میں وکالت، جہادِ کشمیر کی مخالفت، پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی مخالفت اور پاکستان کے دفاع اور افواجِ پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کرنے والا یہ گروہ صرف اور صرف غیر ملکی اشاروں پر مصروفِ کار ہے۔

*****

قائداعظمؒ اور کشمیر

آغا حسن ہمدانی

...•••...

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زندگی کا مشن اور مقصد پاکستان کا قیام اور دنیائے اسلام کا اتحاد تھا۔اس لئے انہیں ہر وہ شخص عزیز تھا جو پاکستان اور اُمتِ محمدیؐ کا حامی ہو۔ ہر اس تحریک سے لگاؤ تھا جو ظالموں کے خلاف شروع کی گئی ہو۔اس لئے اس جدوجہد کے حامی تھے جو کشمیر کی آزادی کے لئے تھی۔کشمیر چونکہ پاکستان کے اجزائے ترکیبی کا مرکزی نقطہ قرار پایا تھا، اس لئے قائداعظمؒ کو کشمیر کے ساتھ بہت زیادہ اُنس تھا۔آزادی اور حریت نے مسلمانوں کو ڈوگرہ راج کے خلاف آواز اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔1924ء میں پہلی بار کشمیری مسلمانوں نے وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ سے ملاقات کر کے ڈوگرہ راج کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور مطالبہ کیا کہ کشمیری عوام کو اُن کے حقوق دیئے جائیں۔لارڈ ریڈنگ کے کہنے پر مہاراجہ نے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔وائسرائے کی برطانیہ واپسی کے بعد مہاراجہ نے مطالبہ کرنے والے مسلمانوں کو جیل بھیج دیا اور بعض کو ریاست بدر کر دیا۔اس زمانہ میں جموں کے چند تعلیم یافتہ مسلمانوں نے جن میں چوہدری غلام عباس پیش پیش تھے، ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن قائم کر لی جس کا پہلا اجلاس 1924ء میں ہوا۔ایسوسی ایشن نے دو اہم خدمات انجام دیں۔ایک تو جموں کے مسلمانوں میں سیاسی سرگرمیوں میں دلچسپی لینے کا شوق پیدا کیا اور دوسرا ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے وہ لیڈرشپ عوام میں متعارف ہوئی جس نے آگے چل کر ریاست کی سیاست میں اہم رول ادا کیا۔

وادیٔ کشمیر میں سیاسی شعور کا دور جموں سے بہت بعد میں شروع ہوا۔سری نگر میں سیاسی کام

کی ابتداء کرنے والے وہ مسلمان نوجوان تھے جو ابھی ہندوستانی یونیورسٹیوں میں تعلیم سے فارغ ہو کر ریاست پہنچے تھے۔ان نوجوانوں کی باقاعدہ تنظیم شیخ عبداللہ نے کی۔شیخ عبداللہ جب 1930ء میں جموں آئے تو چوہدری غلام عباس سے ملاقات ہوئی اور اس طرح دونوں تنظیمیں ایک دوسرے سے متعارف ہوئیں۔اسی ملاقات میں سری نگر میں ینگ مینز ایسوسی ایشن کی شاخ قائم کرنے کی منظوری ہوئی۔شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس نے آگے چل کر تحریکِ آزادیٔ کشمیر میں ایک نئی رُوح پھونکی۔13 جولائی 1931ء کو عید کے موقع پر خطبۂ عید پر جو جھگڑا ہُوا،اس سے تحریکِ آزادی ایک نئے اور اہم موڑ میں داخل ہوگئی۔بقول چوہدری غلام عباس اگر یہ دن کیلنڈر میں موجود نہ ہوتا تو یقیناً ریاست کشمیر کی سیاسی تاریخ جو 1931ء سے آج تک مرتب ہورہی ہے، بالکل مختلف ہوتی۔1932ء میں پہلی بار کشمیر میں مسلم کانفرنس منعقد کی گئی جس کا اوّلین مطالبہ ریاست میں زرعی اصلاحات نافذ کرنا تھا۔یہ کانفرنس 1939ء تک کشمیریوں کی معاشی، سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کے لئے سرگرم رہی۔

جون 1939ء میں مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شیخ عبداللہ نے تجویز منظور کرائی کہ اس تنظیم کا نام تبدیل کر کے نیشنل کانفرنس رکھا جائے۔دراصل شیخ عبداللہ بنیادی طور پر کانگریسی لیڈروں کے خیالات سے بہت متاثر تھے وہ ریاستِ کشمیر میں کانگریسی فکر کو رائج کرانے کے لئے ایک نیشنلسٹ تنظیم قائم کرنے کے خواہاں تھے۔دوسری طرف مسلم کانفرنس کے ممبر مثلاً چوہدری غلام عباس اور سردار گوہر الرحمن وغیرہ جو شیخ عبداللہ کے فیصلے سے متفق نہیں تھے،انہوں نے مسلم کانفرنس کو از سرِ نو زندہ کیا اور اپنا سیاسی مستقبل مسلم لیگ سے وابستہ کردیا۔اس زمانے میں مسلم لیگ قائداعظمؒ کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کی آزادی کے لئے انگریزوں اور ہندوؤں کے خلاف نبرد آزما تھی۔

قائداعظمؒ نے 26 دسمبر 1938ء کو مسلم لیگ کے اجلاس پٹنہ میں ریاست کشمیر کی تحریکِ آزادی کے متعلق فرمایا: ''ریاستوں میں یہ شورش کیوں ہے؟ حیدرآباد میں آریہ سماجیوں اور ہندو مہاسبھائیوں کی تمام طاقتیں کیوں جمع کی جارہی ہیں؟ آریہ سماجی، ہندو مہاسبھا، کانگریسی

قوم پرست اور کانگریسی اخبار کشمیر کے معاملے میں کیوں چُپ سادھے ہُوئے ہیں؟ کیا اس لئے کہ کشمیر ہندو ریاست ہے یا اس وجہ سے کہ کشمیر کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔''

قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لاہور(1940) میں شرکت کے لئے مسلم کانفرنس کے رہنماؤں کو بھی دعوت نامے بھیجے تاکہ مطالبہء پاکستان میں وہ تمام عناصر ہم زبان ہوں جو اس کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہیں۔

قائداعظمؒ کشمیریوں پر ڈوگرہ ظلم وتشدد کے سخت خلاف تھے اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہر اُس تحریک کو ہر ممکن تقویت پہنچانے کی کوشش کی جس کا مقصد ظلم وتشدد کا خاتمہ تھا، خواہ وہ مسلم کانفرنس کی جانب سے ہو یا نیشنل کانفرنس کی طرف سے۔ **قائداعظمؒ** نے کانگریس سے شدید نظریاتی اختلاف کے باوجود شیخ عبداللہ جو اس زمانے میں کانگریس کے طرف دار تھے، کی دعوت نہایت فراخدلی کے ساتھ قبول کر کے سری نگر کے عظیم الشان جلسہ میں شرکت کی۔ **قائداعظمؒ** نے نیشنل کانفرنس کے سپاسنامے کے جواب میں فرمایا: ''کشمیر کی تحریکِ آزادی میں ریاست کی مسلم اکثریت کے ساتھ ہندو اور سکھ اقلیتیں بھی شامل ہیں اور ان کا بھی یہ موقف ہے کہ کشمیر پر ڈوگروں کا قبضہ ناجائز اور غاصبانہ ہے۔ مسلم لیگ ریاست کی تحریکِ آزادی میں ریاستی عوام کے ساتھ ہے۔''

جب **قائداعظمؒ** نے دیکھا کہ شیخ عبداللہ اس کے باوجود کانگریس کی حمایت کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تو انہوں نے شیخ عبداللہ کی ''کشمیر چھوڑ دو'' تحریک پر ان الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا: ''ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک انگریزوں کے خلاف کم اور مسلم لیگ کے خلاف زیادہ تھی اور اس کا مقصد پاکستان کے مطالبہ کو تارپیڈو کر کے اُڑا دینا ہے۔''

قائداعظمؒ نے مسلم کانفرنس کی حمایت کے لئے مسلم لیگ کی باقاعدہ حمایت کا یقین دلایا اور کشمیر کے دورۂ 1943ء کے دوران مسلم کانفرنس کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''کشمیر میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔ اکثریت کا فرض ہے کہ وہ وطن کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرے۔ اگر ریاست کی اقلیتیں اس جدوجہد میں اکثریت کا ساتھ دیتی ہیں تو

ان کے جذبہ حب الوطنی کی قدر کرنی چاہیے اور حصولِ آزادی کے بعد ان کے ساتھ فراخدلانہ برتاؤ کرنا چاہیے تا کہ وہ بھی اکثریت کی طرح آزادی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوسکیں۔"

1946ء میں مسلم کانفرنس کے زعماء شملہ میں قائدِ اعظمؒ ملے تو یہ فیصلہ ہُوا کہ قائدِ اعظمؒ کو کشمیر کے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے مسلم کانفرنس ان سے رابطہ قائم رکھے گی۔اس طرح اشارہ کرتے ہوئے 5 جون 1946ء کو قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:

"کشمیر سے مختلف قسم کی اطلاعات آ رہی ہیں۔مسلم کانفرنس کے جن لیڈروں نے مجھ سے شملہ میں ملاقات کی تھی،انہوں نے مجھے پوری رپورٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔جھگڑے کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو،مگر حکومت کا رویہ تشدد کا ہے اور ہر جگہ مسلمان ہی نشانہ بنے ہوئے ہیں۔میں کشمیر کے مہاراجا اور وہاں کے وزیرِ اعظم کو خبردار کرتا ہوں کہ کسی بے گناہ مسلمان کو کوئی تکلیف اور اذیت نہ پہنچے۔لاپروائی سے ہرگز کام نہ لیا جائے ورنہ تم لوگ مسلمانوں کو اس آگ میں کودنے پر مجبور کردو گے۔"

قائدِ اعظمؒ کے ان الفاظ سے مسلم کانفرنس کو مزید تقویت پہنچی لہٰذا اس نے جون 1946ء میں ایک قرارداد کے ذریعے ریاست کے مسلمانوں سے کہا کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ڈائریکٹ ایکشن کے لئے تیار ہو جائیں۔ڈائریکٹ ایکشن کی تفصیلات طے کرنے کے لئے مسلم کانفرنس کا اجلاس 1946ء میں ہونے والا تھا۔مہاراجہ نے اس پر پابندی لگا دی اور کانفرنس کے کئی رہنماؤں کو جن میں چوہدری غلام عباس بھی شامل تھے،جیل میں بھیج دیا۔اس کے باوجود مسلم کانفرنس نے 1947ء کے عام انتخابات میں کشمیر اسمبلی کی 21 میں سے 15 نشستیں حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ مسلم کانفرنس ہی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔اُدھر 3 جون 1947ء کو جب انگریزوں نے ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کیا تو طے پایا کہ ریاستوں کے حکمران بھارت یا پاکستان،جس کے ساتھ چاہیں الحاق کر سکتے ہیں۔اس پر قائدِاعظمؒ نے مسلم کانفرنس کے قائدین سے 11 جولائی 1947ء کو ملاقات کی جس کے بعد قائدِاعظمؒ نے فرمایا:

"کشمیر مسلمانوں کے ذہن اور توجہ پر چھایا ہوا ہے۔یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے کہ کیا

کشمیر پاکستان میں شامل ہو رہا ہے۔ میں ایک سے زائد مرتبہ یہ واضح کر چکا ہوں کہ ہندوستانی ریاستیں اس امر کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں کہ وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں یا ہندوستان کے ساتھ یا خود مختار و آزاد ہوں۔ اس میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ مہاراجہ اور حکومت کشمیر اس مسئلہ پر انتہائی توجہ اور خلوصِ نیت سے غور کریں گے اور صرف حکمرانی کے مفادات کو ملحوظ نہ رکھیں گے بلکہ عوام کے مفادات کا بھی خیال رکھیں گے۔ ہم پہلے بھی واشگاف الفاظ میں واضح کر چکے ہیں کہ ہم کسی ریاست کو نہ مجبور کریں گے، نہ ڈرائیں دھمکائیں گے، نہ کسی قسم کا دباؤ ڈالیں گے۔''

قائد اعظمؒ کا یہ بیان مسلم لیگ اور پاکستان کی کشمیر اور دیگر ریاستوں کے متعلق پالیسی کا ایک شاندار باب ہے اسی نصب العین کے تحت مسلم کانفرنس نے جو ریاست کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی، 19 جولائی 1947ء کو حسب ذیل قرارداد کے ذریعے پاکستان کے ساتھ الحاق کا رسمی طور پر اعلان کر دیا:

''مسلم کانفرنس کا یہ کنونشن اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ جغرافیائی حالات، مجموعی آبادی کی اسی فیصد مسلم اکثریت، پنجاب کے اہم دریاؤں کی ریاست میں سے گزرگاہیں، زبان، ثقافت، نسل، معاشی تعلقات اور ریاست کی سرحدوں کا پاکستان سے اشتراک، یہ سب حقائق اس بات کو ضروری قرار دیتے ہیں کہ ریاست جموں کشمیر پاکستان کے ساتھ الحاق کرے۔''

کانگریس مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کے خلاف سازشوں میں مصروف تھی اور ایک گہری سازش کے ذریعے ریاست کشمیر کو ہتھیانے کے درپے تھی۔ 47-1946ء کے ایک حصے میں بڑے بڑے کانگریسی لیڈر گاندھی اور اچاریہ کرپلانی کے علاوہ خان عبدالغفار خان، ڈاکٹر سہنا اور چمن لال وغیرہ مہاراجہ کی حکومت کے ساتھ ساز باز میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی ساتھ نیشنل کانفرنس کے جلاوطن لیڈر بخشی غلام محمد، غلام محمد صادق اور شیخ محمد عبداللہ جو قید میں تھے، سے بھی پُراسرار ملاقاتیں جاری رکھیں۔ 27 اکتوبر کو ہندوستان نے اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کیں اور بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ 2 نومبر 1947ء کو نیشنل کانفرنس نے شیخ عبداللہ کی سربراہی میں حکومت کا انتظام سنبھال لیا اور مسلم کانفرنس کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ ڈوگرہ راج کے اس اقدام پر ریاست کشمیر میں

آزادی کی لہر دوڑ چکی تھی۔ مسلم کانفرنس کے زُعماء سردار محمد ابراہیم خان اور سردار عبدالقیوم خان کی قیادت میں مجاہدین آزادی نے ریاست کا ایک بڑا حصہ مہاراجہ کے چنگل سے آزاد کرا لیا جس کے بعد یہاں ایک آزاد جموں وکشمیر حکومت قائم کر دی گئی۔

اس پر قائد اعظمؒ نے فرمایا:

''ہری سنگھ نے ریاستی عوام کی مرضی کے خلاف بھارت کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کی جس سے کشمیری عوام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس الحاق کے مخالفین میں مسلم اکثریت کے علاوہ غیر مسلموں کی اکثریت بھی شامل ہے، وہ ہری سنگھ کے اس اقدام کو ریاست اور ریاستی عوام کے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں۔ کشمیری عوام نے ہری سنگھ سے اپیل کی کہ وہ ریاست کو پاکستان کے ساتھ شامل کرے، لیکن اس نے ذاتی اقتدار کے پیش نظر اس عوامی مطالبہ کی طرف توجہ نہ دی اور اس کو دبانے کے لئے طاقت استعمال کی لیکن عوام نے طاقت کا جواب طاقت سے دیا اور ہری سنگھ کو ریاست سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ جس نے اپنا اقتدار بچانے کے لئے بھارت کی پناہ لی جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کشمیر بھارت میں شامل نہیں ہُوا بلکہ ہری سنگھ شامل ہوا ہے۔''

قائد اعظمؒ نے مسئلہ کشمیر کو پُرامن طریقے سے حل کرنے کے لئے بھارتی حکمرانوں کو پیش کش کی کہ پاکستان اور بھارت کے گورنر جنرلز کی نگرانی میں کشمیر میں استصواب رائے عامہ کرایا جائے اور کشمیر کے عوام جو فیصلہ کریں، دونوں حکومتیں اسے تسلیم کر لیں۔ بھارت نے اس تجویز کو مسترد کر کے کشمیر پر فوجی قوت کے ذریعے قبضہ کرنے کے لئے حملہ کر دیا۔ قائد اعظمؒ کو جب اس حملہ کی اطلاع ملی تو انہوں نے حکم دیا کہ بھارتی جارحیت کو روکنے کے لئے وادئ کشمیر میں پاکستانی فوج بھیج دی جائے۔ مسئلہ کشمیر کو حل کرنے کے لئے یکم نومبر کو لاہور میں قائد اعظمؒ اور لارڈ مونٹ بیٹن کی ملاقات ہوئی۔ اے کے جانسن اپنے روزنامچے میں لکھتا ہے:

''اس ملاقات میں قائد اعظمؒ نے الزام لگایا کہ کشمیر میں جو سنگین حالات پیدا ہوئے ہیں ان کی ذمہ داری حکومتِ ہندوستان پر ہے۔''

اس ملاقات میں قاید اعظمؒ نے لارڈ مونٹ بیٹن کے سامنے سہ نکاتی تجاویز پیش کیں :
(1) فوری جنگ بندی، (2) افواج کی واپسی، (3) استصواب رائے۔ بھارتی حکمرانوں نے ان تجاویز کو ماننے سے انکار کیا تو مسئلہ کشمیر کو یکم جنوری 1948ء کو اقوام متحدہ میں پیش کر دیا گیا۔

اقوام متحدہ میں کشمیر کے مسئلہ سے متعلق قایدِ اعظمؒ نے ایک وفد روانہ کیا اور اسے ہدایت کی کوئی قرارداد اس وقت تک منظور نہ کی جائے جب تک اس میں رائے شماری کے طریق کار کا تفصیلی ذکر نہ کیا جائے۔ اس وفد کے ممبر اصفہانی صاحب کا کہنا ہے :

''میں امریکہ سے مسلسل قائداعظمؒ کو مسئلہ کشمیر کے متعلق تمام کارروائی سے آگاہ کرتا رہتا تھا جس سے وہ بڑے خوش تھے۔'' اصفہانی صاحب 14 جون 1948ء کے قایدِ اعظمؒ کے خط بنام اصفہانی میں قایدِ اعظمؒ کے یہ الفاظ دہراتے ہیں: ''ہم ان سب مسائل سے جن کا ہمیں سامنا ہے، کامیابی سے عہدہ برآ ہوجائیں گے۔ محض اس وجہ سے کہ ہمارا مؤقف برحق ہے اور ہم صورت حال کا دیانت داری سے مقابلہ کررہے ہیں اور عدل وانصاف کے لئے لڑ رہے ہیں۔''

قائداعظمؒ کے ذہن میں یہ بات پختہ ہوچکی تھی کہ حق وانصاف کی جنگ میں ہماری کامیابی یقینی ہے اور کشمیر کا مسئلہ انصاف کے اصولوں کے تحت حل ہوجائے گا۔ کشمیر کو وہ پاکستان کا لازمی حصہ تصور کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی وفات سے چند روز قبل کہا تھا کہ کشمیر سیاسی اور فوجی اعتبار سے پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خوددار قوم یہ برداشت نہیں کرسکتی کہ اپنی شہ رگ کو دشمن کی تلوار کے حوالے کردے۔ مگر افسوس کہ کشمیر کی آزادی کا یہ داعی اعظم اپنی حیات میں اپنے نصب العین کو نہ پا سکا اور 11 ستمبر 1948ء کو اپنے دل میں اس بہت بڑے صدمے کو سمیٹتے ہوئے اس دارِ فانی سے کوچ کرگیا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ اپنی کتاب ''میرا بھائی'' میں لکھتی ہیں :

''قائداعظمؒ جب موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا تھے تو غشی کی حالت میں بھی ان کی زبان پر مسئلہ کشمیر زندہ تھا۔ موت سے چند لمحے پہلے وہ بیہوشی کے عالم میں ٹوٹے ہوئے الفاظ میں کہہ رہے تھے کہ اللہ، کشمیر، پاکستان...''

*****

قــرارداد پاکستان کاپس منظــر

ڈاکٹر صفدر محمود

...•••...

میں اُن مغربی مورخین سے متفق نہیں ہوں جو محض اس وجہ سے ظہور پاکستان کو ایک فوری واقعہ قرار دیتے ہیں کہ پاکستان مختصر سے عرصے میں وجود میں آ گیا۔تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پاکستان کا ظہور مسلمان عوام اور مسلمان رہنماؤں کی طویل جدو جہد کا نتیجہ تھا۔دراصل یہ کئی عشروں پر محیط عمل کا نقطہ عروج تھا۔صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے باوجود ہندی مسلمان ہمیشہ ایک آزاد مسلم مملکت کے خواب دیکھتے رہے ۔کیونکہ انہوں نے اس امر کا ادراک کر لیا تھا کہ متحارب اکثریت کے ہاتھوں ان کے دینی، ثقافتی اور سیاسی تشخص کو زبردست خطرات لاحق ہیں ۔اس غیر یقینی اور مبہم صورت حال کو قائداعظم نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ۔"ہم جانتے ہیں کہ گزشتہ بارہ صدیوں کی تاریخ ہم میں اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے ۔اس تمام عرصے میں ہندوستان، ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہوتا رہا ہے ۔اس وقت جو مصنوعی اتحاد نظر آتا ہے وہ محض برطانوی اقتدار کا نتیجہ ہے ۔"

مسلمانوں میں ایک علیحدہ وطن کی ضرورت کا احساس تدریجاً پیدا ہوا اور جوں جوں ان پر ہندوؤں کے عزائم اور ذہنیت کھلتی گئی اس میں شدت پیدا ہوتی چلی گئی۔اس طرح ہندوستان میں سرگرم سیاسی عوام نے انہیں اس منطقی نتیجہ پر پہنچایا ہے ۔چنانچہ 1940 کی قرارداد لاہور ان کی انہی اجتماعی خواہشات کا عملی اظہار تھا۔ایک طرح سے یہ ان کے صدیوں پرانے خواب کی تعبیر تھی اس لئے یہ قرارداد تاریکی میں بھٹکنے والے مسلمان عوام کے لئے روشنی کی کرن ثابت ہوئی اور پھر اسے ہماری تاریخ میں ایک مینارۂ نور کی حیثیت حاصل ہو گئی۔اس قرارداد نے مشکلات

سے بھر پور ہماری جہدِ آزادی کی راہوں کو روشن کر دیا۔قرارداد لاہور (جسے بعد میں قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا) بڑی تیزی سے مسلمانوں میں مقبول ہو گئی اور مسلم لیگ کی قیادت اور کارکنوں کے لئے طاقت کا سرچشمہ ثابت ہوئی۔

مسلمان برصغیر میں ایک فاتح کی حیثیت سے آئے تھےلیکن اپنے پیشروؤں کی طرح نہ تو انہوں نے مقامی لوگوں کی تذلیل کی اور نہ ہی ان سے اچھوتوں کا سا سلوک کیا۔وہ یہیں بس گئے۔یہاں انہوں نے سلطنتیں قائم کیں اور اپنی نسلوں کو آباد کیا۔وہ صدیوں ہندوستان پر حکومت کرتے رہے۔لیکن پُرامن بقائے باہمی کے باوجود مسلمان ہندو ہر لحاظ سے دو مختلف اقوام رہیں۔البیرونی نے صدیوں پہلے کہا تھا:"ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہیں اور انہیں دور سے بھی بآسانی پہچانا جاسکتا ہے۔"

یہی وہ سیاق و سباق تھے جس کے حوالے سے قائداعظم نے علی گڑھ میں ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"پاکستان اسی روز قائم ہو گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔"

یہ برصغیر میں مسلم حکومت قائم ہونے سے بہت پہلے کی بات ہے۔

مسلمانوں کو جب تک فوجی بالادستی حاصل رہی، ہندو انہیں برداشت کرتے رہے۔لیکن جیسے ہی ان کی حکومت میں انحطاط پیدا ہوا وہ سکھوں، جاٹوں اور مرہٹوں سے مل کر ہندوستان میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تل گئے۔شاہ ولی اللہ کی تحریک اور ان کی طرف سے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملے کی دعوت کا اصل مقصد بھی مسلمانوں کو ان خطرات سے بچانا تھا جو ہندوستان کے افق پر منڈلا رہے تھے۔شاہ ولی اللہ کی تحریروں سے مترشح ہوتا ہے کہ انہیں یقین تھا کہ برصغیر میں مسلمانوں کے دین اور قومی تشخص کو بچانے کے لئے اس علاقہ کے کسی نہ کسی حصے میں مسلمانوں کی سیاسی حاکمیت اور اقتدار کا برقرار رہنا ضروری ہے۔برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کے لئے ایک آزاد ملک اور حکومت کے خواب کی جڑیں ہماری تاریخ میں نہایت

گہری تھیں۔لیکن ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلط نے سیاسی منظر ہی بدل دیا لہذا مسلمانوں نے بھی اپنی حکمت عملی تبدیل کرلی ۔ چنانچہ وہ مشترکہ دشمن یعنی برطانیہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندو مسلم اتحاد کے بارے میں سوچنے لگے ۔سرسید پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کیا۔وہ کہا کرتے تھے کہ ہندو اور مسلمان ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھیں ہیں ۔ان میں سے کسی ایک کو نقصان پہنچا تو دلہن کا حسن ماند پڑ جائے گا۔

لیکن جوں جوں ان پر ہندوؤں کے عزائم کھلے' وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں اقوام زیادہ عرصے تک اکٹھی نہیں رہ سکتیں' ایک دن انہیں الگ ہونا ہوگا اور یہ امر مسلمانوں کے وسیع تر مفاد میں ہوگا۔انہوں نے ہندوستان میں برطانوی جمہوری اداروں کے قیام کی اسی لئے مخالفت کی کہ ان سے ہندو اکثریت کے اقتدار کو دوام حاصل ہو جائے گا۔سرسید کے یہ الفاظ ان کے تاریخی شعور اور فہم کا بہترین ثبوت ہیں ۔

"یہ ممکن نہیں کہ ان میں ایک قوم حاکم رہے اور دوسری محکوم بن جائے ۔"

قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اپنے سیاسی کیریئر کا آغاز ہندو مسلم اتحاد کے ایک مخلص حامی کی حیثیت سے کیا۔یہاں تک کہ انہوں نے 1906 میں مسلم لیگ کے قیام اور مسلمانوں کے جداگانہ نیابت کے فیصلہ کی محض اس لئے مخالفت کی کہ ان کے نزدیک مسلمانوں کے اس اقدام سے اتحاد کے تصور کی پیش رفت کو نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ہندو مسلم اتحاد کے لئے ان کی پرجوش مساعی کے نتیجہ میں 1916 کے مشہور لکھنو پیکٹ پر دستخط ہوئے اور قائداعظم کو ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا خطاب ملا۔اگلی دو دہائیوں میں انہوں نے اپنی اس حیثیت کو برقرار رکھنے اور یقینی بنانے کے لئے بھرپور کوشش کی جس پر معاہدہ لکھنو میں اتفاق رائے ہوا تھا۔دہلی کی مسلم تجاویز (1917) کل جماعتی مسلم کانفرنس کی قرارداد (1929) جناح کے چودہ نکات (1929) گول میز کانفرنس میں پیش کی جانے والی شرائط (1930-1933) اور کانگریسی رہنماؤں سے مذاکرات کا صرف ایک ہی مقصد اور مدعا تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایسے

تحفظات حاصل کئے جائیں کہ جن کے ذریعے ان کی جداگانہ دینی اور ثقافتی حیثیت کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ پروفیسر شریف المجاہد کے الفاظ میں:

"ان کا مطالبہ تھا۔۔۔۔آئین وفاقی ہو جس کے تحت فاضل اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ مرکزی اسمبلی اور کابینہ میں مسلمانوں کی نیابت کم از کم ایک تہائی ہو۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی مستقل اکثریت تسلیم کی جائے۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاحات جاری کی جائیں۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا جائے۔ مسلمانوں کے لئے جداگانہ نیابت کو اور فرقہ وارانہ امور میں دوہرے ووٹ کی شق کو برقرار رکھا جائے اور آئین میں وفاق میں شامل تمام اکائیوں کی رضامندی کے بغیر کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔"

"ان تمام مطالبات کے پس منظر میں یہ خواہش کارفرما تھی کہ ایک صحیح وفاقی آئین کے تحت جس میں تحفظ وحقوق کا مناسب اہتمام ہو، توازن قائم کرنے کے لئے چھ ہندو صوبوں کے مقابلے میں پانچ مسلم صوبے تشکیل دیے جائیں۔ لیکن ان تمام مطالبات پر کانگریس کا ردعمل شرانگیز، غیر منطقی بلکہ توہین آمیز تھا۔"

دریں اثنا قائداعظم کانگریسی رہنماؤں سے بتدریج مایوس ہوتے چلے گئے۔ اس مایوسی کا آغاز کانگریس کے اجلاس منعقدہ ناگپور 1920 سے ہوا تھا جس میں قائداعظم نے کانگریس کی طرف سے گاندھی کے زیراثر نئی سیاسی حکمت عملی اپنانے کے فیصلے کی نہایت جرأت مندی سے مخالفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب قائداعظم ناگپور سے روانہ ہوئے تو ان کی طبیعت میں تلخی اور غم وغصہ پیدا ہو چکا تھا۔ بعدازاں مسلمانوں کو ہندو بنانے کی شدھی اور سنگھٹن تحریکوں سے شروع ہوکر گاندھی کی ستیہ گرہ، نہرو رپورٹ، کل جماعتی کلکتہ کنونشن اور سات صوبوں میں کانگریس راج کے واقعات نمودار ہوئے، جن سے فرقہ وارانہ فسادات کو فروغ ملا اور لکھنو پیکٹ کی پیدا کردہ دوستانہ فضا ختم ہوکر رہ گئی۔ ان واقعات نے مسلمانوں پر ہندوؤں کے اصل عزائم بے نقاب کر دیئے۔

برطانوی راج کے جانشین کی حیثیت سے چونکہ ہندوؤں نے "ہندوراج" قائم کرنے کا پختہ ارادہ کررکھا تھا اس لئے دونوں قوموں کے درمیان اختلافات میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ قائداعظم نے نہرو رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے بجاطور پر "راستے الگ" (Parting of Ways) ہونے کی دستاویز قرار دیا تھا۔اسی طرح کانگریسی وزارتوں نے مسلمانوں میں یہ تکلیف دہ احساس پیدا کیا کہ اگر صوبوں میں کانگریسی راج کے تحت رونما ہونے والے واقعات ہندوقومی حکومت کی ایک تصویر ہیں تو پھر یقیناً اس حکومت میں مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔۔اس صورت حال کا حتمی تجزیہ انتہائی مایوس کن اور تکلیف دہ تھا اور اسی تجزیے نے ہندی مسلمانوں کو مطالبۂ پاکستان پر مجبور کیا۔

ہندی مسلمان ابھی جداگانہ ملک کے دھندلے دھندلے خواب ہی دیکھ رہے تھے کہ علامہ اقبال نے 1930 میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد سے خطاب کرتے ہوئے اپنے صدارتی خطبے میں ایک جداگانہ مملکت کا ایک واضح اور جامع تصور پیش کردیا۔علامہ اقبال نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ وطن کا جو تصور پیش کیا وہ جغرافیائی اورنظریاتی عوامل پر مبنی تھا۔ انہوں نے فرمایا۔

"میرے نزدیک پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کے صوبوں کو ایک واحد مملکت میں ضم کردینا چاہئے جسے برطانوی ایمپائر یا اس سے باہر مکمل خودمختاری حاصل ہو۔کیونکہ میرے نزدیک شمال مغربی ہندوستان میں آزاد مسلم ریاست کا قیام ہی شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لئے واحد ذریعہ نجات ہے۔"

اس ریاست کے نظریاتی جواز پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے کہا:

"مسلم مملکت کا میرا یہ مطالبہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے منفعت بخش ہو گا۔ ہندوستان کو اس سے حقیقی امن اور سلامتی مل جائے گی اور اسلام کو اس سے ایسا موقع میسر آ جائے گا کہ جس سے یہ اپنے قوانین،تعلیم اور ثقافت کو پھر سے زندگی اور حرکت عطا کر سکے اور

انہیں عصر حاضر کی روح کے قریب آنے کے قابل بنا سکے۔''

گویا علامہ اقبال نے پاکستان کی صورت میں ایک ایسی مسلم ریاست کا تصور پیش کیا تھا جہاں قوانین، تعلیم اور ثقافت کو پھر سے حقیقی اسلامی سانچے میں ڈھالا اور عصر حاضر کی روح کے قریب لایا جائے گا۔

پاکستان کا تصور یکا یک پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی اچانک آسمان سے اترا تھا بلکہ اس نظریئے نے بتدریج ارتقا پایا۔ اکثریتی اور اقلیتی صوبوں کے مسلم رہنماؤں کے اتفاق رائے کے لئے اس پر تفصیلی بحثیں ہوئیں تا کہ اسے ہندی مسلمانوں کا اجتماعی واحد اور آخری مطالبہ قرار دیا جا سکے۔ سندھ مسلم لیگ نے 1938 میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ مسلم رہنماؤں کے اذہان کی ٹھیک ٹھیک اور صحیح عکاسی کرتی تھی کہ وہ کیا سوچتے تھے قرارداد میں مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا۔

''اس کی فرقہ ورانہ ذہنیت اور مسلم کش پالیسی کے باعث اکثریتی قوم سے کسی نیکی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔''

قرارداد میں زور دیا گیا :

'' مسلمانوں کے ہندوؤں سے جو اختلاف ہے، اس کا اصل منبع دین، زبان، رسم الخط، ثقافت، معاشرتی قوانین اور زندگی کے بارے میں انداز فکر ہے۔''

پروفیسر خالد بن سعید کے الفاظ میں :

''اس قرارداد میں مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ سرکاری طور پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو دو مختلف اقوام قرار دیا تھا۔''

چنانچہ سندھ مسلم لیگ کانفرنس نے آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کی کہ وہ ایسی آئینی سکیم تیار کرے جس کے تحت مسلمانوں کو مکمل آزادی حاصل ہو جائے۔ چنانچہ سندھ مسلم لیگ کی 1938 کی اس قرارداد کو 23 مارچ 1940 کی قرارداد لاہور سمیت اس مسئلہ پر منظور کی

جانے والی تمام قراردادوں پر سبقت اور فوقیت حاصل ہے۔

بہرحال 1939 میں تقسیم ناگزیر نظر آتی تھی۔اس وقت مسلم رہنماؤں کی اکثریت اس کی قائل ہو چکی تھی۔ستمبر 1939 میں قائداعظم نے وائسرائے سے دوران گفتگو فرمایا۔"وہ قائل ہو چکے ہیں کہ ہندوستان کے مسئلہ کا حل اس کی تقسیم ہے۔"آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے مارچ 1939 کے اجلاس میں قائداعظم کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی تا کہ علامہ اقبال، چودھری رحمت علی، ڈاکٹر سید عبداللطیف اور دوسرے لیڈروں کی طرف سے پیش کی جانے والی تمام تجاویز اور مسودوں کا جائزہ لیا جائے۔شاہ نواز ممدوٹ کے علاوہ اس کمیٹی کے دوسرے دو ممبران عبداللہ ہارون اور سکندر حیات نے بھی اپنی طرف سے تجاویز پیش کیں۔لیگ کمیٹی نے ان تمام تجاویز اور منصوبوں پر تفصیل سے غور وخوض کیا جس کے بعد مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ کے لاہور اجلاس سے کچھ دیر پہلے ہونے والی میٹنگ میں ایک سکیم کی منظوری دے دی جو 23 مارچ 1940 کو منظور ہونے والی"قرارداد لاہور" کی بنیاد رکھے۔

قائداعظم نے اجلاس لاہور میں اپنی صدارتی تقریر میں ہندی مسلمانوں کی تاریخ کا نچوڑ پیش کرتے ہوئے کہا:

"ہندو اور مسلمان الگ الگ فلسفۂ مذہب رکھتے ہیں۔دونوں کی معاشرت جدا جدا ہے اور دونوں کا ادب ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ان میں باہمی شادیاں نہیں ہوتیں۔وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتے۔وہ دو الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر قائم ہیں۔ان کا تصور حیات اور طرز حیات الگ الگ ہے۔یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف تاریخوں سے وجدان اور ولولہ حاصل کرتے ہیں۔ان کا رزمیہ ادب الگ ہے۔ان کے مشاہیر الگ الگ ہیں اور ان کا تاریخی سرمایہ جدا جدا ہے۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کے ہیرو دوسرے کے دشمن ہوتے ہیں اور اسی طرح ان کی فتح اور شکست ایک دوسرے کے لئے مختلف حیثیت رکھتی ہے۔

دو ایسی قوموں کو ایک نظام سلطنت میں جمع کر دینا جہاں ایک قوم عددی لحاظ سے اقلیت ہو اور دوسری اکثریت ہو، نہ صرف باہمی مناقشت کو بڑھائے گا بلکہ بالآخر اس نظام کی بربادی کا باعث ہوگا جو ایسے ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔ مسلمان ہر اعتبار سے ایک مستقل قوم ہیں اور انہیں ان کا الگ وطن، ان کا اپنا علاقہ، اور اپنی حکومت ملنی چاہئے ۔"

قرارداد لاہور مولوی فضل الحق نے پیش کی اور 23 مارچ 1940 کو منظور کر لی گئی ۔اس میں ایسی آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا جو ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں میں جغرافیائی لحاظ سے متصل ایسے علاقوں پر مشتمل ہوں جہاں مسلمان ہر اعتبار سے بہ تعداد آبادی اکثریت رکھتے ہوں ۔ اس قرارداد میں ترمیم اس وقت کی گئی جب مسلم لیگ نے منتخب ارکان اسمبلی کے اجلاس منعقدہ دہلی 1946 میں واحد مسلم ریاست کا مطالبہ کیا۔ بہر حال قرارداد لاہور نے اسلامیان ہند کو تصورات سے نکال کر ان کے سامنے ان کی منزل متعین صورت میں پیش کر دی جو ان کے گزشتہ نصف صدی کے خوابوں کی تعبیر تھی۔ ابھی تک وہ تاریکی میں بھٹکتے رہے تھے لیکن اب انہیں غار کے دوسرے سرے پر روشنی کی کرن نظر آنے لگی تھی۔

مارچ 1940 کے بعد ان کی تمام توانائیاں اس مینارۂ نور تک پہنچنے کے لئے وقف ہو گئیں اور انہوں نے اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کیا۔ گویا یہ ان کی زندگی میں ایک انقلاب آفریں دور کا نقطۂ آغاز تھا۔ ان کا یہ کاروانِ شوق اپنے قائد کی قیادت میں "اتحاد، ایمان اور تنظیم" کے جذبے سے سرشار اس طرح آگے بڑھا کہ بالآخر اپنے تصورات اور اپنے خوابوں کے جزیرے۔۔۔ پاکستان تک پہنچ کر ہی دم لیا۔

*****

سب نے دیکھا، سب نے کہا

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

...•••...

ہمارے قائدِ اعظمؒ جن کے خداداد عزم و ہمت اور بے پناہ قوتِ ارادی سے ہمیں آزادی جیسی نعمت نصیب ہوئی اور جن کی مسلسل تگ و دو کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ پاک وطن عطا فرمایا، 25 دسمبر 1876ء کو کراچی کے محلے کھارادر میں پیدا ہوئے اور 76 برس تک عزم و ہمت اور محنت و استقلال کی زندگی گزاری۔ قائدِ اعظمؒ جس مقصد کو پورا کرنے کے لئے دنیا میں آئے، اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا کر 11 ستمبر 1948ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے یوم پیدائش پر ان کے سیرت و کردار کی چند جھلکیاں پیش خدمت ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت

جس زمانے میں قائدِ اعظمؒ انگلستان میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے گئے، اس زمانے میں لندن میں قانون کی اعلیٰ تعلیم کے چار ادارے مڈل ٹمپل، انٹر ٹمپل، گریز ان اور لنکنز ان تھے۔ قائدِ اعظمؒ نے لنکنز ان میں داخلہ لیا، لیکن کیوں؟ اس کی وجہ خود انہوں نے 1947ء میں کراچی بار کے ایک اجتماع میں یوں بیان کی:

"ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت محبت ہے۔ ایک دن میں اتفاقاً لنکنز ان گیا اور میں نے دیکھا کہ اس کے صدر دروازے پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام مبارک دنیا کے عظیم قانون سازوں میں سرِ فہرست تھا۔"

حوصلے کی بلندی

1890ء میں بیس سال کی عمر میں قائداعظمؒ لندن سے امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے واپس آئے تو یہیں بیرسٹری کا آغاز کیا۔لیکن یہ جگہ چھوٹی تھی اور ان کا عزم و حوصلہ وسعت کا طالب تھا۔وہ بمبئی چلے گئے اور وہاں اپنی ذہانت، محنت اور قانونی فہم سے بہت جلد دلوں پر ایسا سکہ جمایا کہ حکومت کے سیکرٹری قانون سر چارلس اولیونٹ نے انہیں پندرہ سو روپے مہینے کے مشاہرے پر پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے پر مامور کرنے کی پیشکش کی، لیکن قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میں اتنی رقم ایک دن میں کمانے کا حوصلہ رکھتا ہوں ۔بعد میں اللہ تعالیٰ کے بھروسے سے خود اعتمادی اور حوصلہ کی بلندی سے انہوں نے اس بات کو سچ ثابت کر دکھایا۔

اصول پسندی

بمبئی میں ایک مشہور تاجر حاجی عبداللہ کریم تھے جنہیں کسی سنگین الزام کے سلسلے میں عدالت طلب کیا گیا۔وہ قائداعظمؒ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا کہ وہ مقدمے کی کتنی فیس لیں گے؟انہوں نے جواب دیا پانچ سو روپے روزانہ۔

حاجی صاحب محتاط آدمی تھے۔پوچھا : مقدمہ کتنا عرصہ چلے گا؟ میرے پاس پانچ ہزار روپے ہیں آپ یہ ساری رقم بطور معاوضہ قبول کر لیں ۔

قائداعظمؒ نے فرمایا : میں یہ رقم قبول نہیں کرونگا۔میری فیس پانچ سو روپے روزانہ ہے ۔ آپ اس فیس پر مجھے اپنا وکیل کریں یا کوئی اور وکیل تلاش کریں ۔حاجی صاحب نے ان کی شرط منظور کر لی اور قائداعظمؒ نے تین روز میں مقدمہ جیت لیا۔ان کی فیس پندرہ سو روپے بنی جو انہوں نے خوشی کے ساتھ قبول کی۔حاجی صاحب نے زیادہ رقم دینا چاہی تو قائداعظمؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

روحانی قندیل

قائدِ اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ غلطی بغیر جھجک کے تسلیم کرلیں، لیکن مسٹر گاندھی اس کے قائل نہ تھے۔ ایک دفعہ جب گاندھی اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے تو اخبار نویسوں کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ میری ''روحانی قندیل'' نے مجھے اس وعدہ خلافی پر مجبور کیا۔

قائدِ اعظمؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے کہا : روحانی قندیل کی ایسی کی تیسی۔ یہ شخص ایمان داری سے کیوں تسلیم کرنہیں لیتا کہ ایسی غلطی ہوسکتی ہے۔

طریق کار

ایک بار قائدِ اعظمؒ نے گاندھی سے کہا : آپ میدانِ سیاست میں کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ کس بات سے خوش ہوں گے، اس کے مطابق آپ اقدام کرتے ہیں، لیکن میرا انداز اس کے برعکس ہے۔ میں پہلے فیصلہ کرتا ہوں کہ کیا بات صحیح اور مناسب ہے۔ پھر اس کے مطابق عمل کرتا ہوں۔ بالآخر لوگ اللہ تعالٰی کے فضل سے میری آواز پر لبیک کہتے ہیں اور مخالفت رفتہ رفتہ ختم ہوجاتی ہے۔

غریبوں کے لئے

1945ء میں مسلم لیگ کے کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے قائدِ اعظمؒ نے فرمایا :

''میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں اور اللہ تعالٰی کا دیا میرے پاس اتنا ہے کہ میں باقی زندگی آرام سے بسر کرسکوں، لیکن اس کے باوجود میں اپنا خون پسینہ ایک کر رہا ہوں اور سارے ملک میں بھاگتا پھرتا ہوں یہ آخر کس لئے؟ یہ تکلیف میں سرمایہ داروں کے لیے نہیں بلکہ غریب مسلمانوں کی خاطر اُٹھا رہا ہوں۔'' انہی دنوں ایک اور جلسے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان قائم ہو جانے کے بعد ہم اس بات کی انتہائی کوشش کریں گے کہ وہاں ہر شخص کی کم از کم اتنی آمدنی ضرور ہو کہ وہ مہذب انسانوں کی طرح زندگی گزار سکے۔''

فضول خرچی سے نفرت

قائداعظمؒ مسلمانوں کی فضول خرچی سے بڑے نالاں تھے۔ایک دفعہ لندن سے بمبئی روانہ ہورہے تھےتو ہوائی اڈے پر انہیں ایک بوڑھا مسلمان ملا جولندن کے مشرقی سرے سے ہوائی اڈے تک محض اس لئے آیا تھا کہ قائدِاعظمؒ سے ہاتھ ملا سکے۔اڈے پر کوئی شخص اسے قائدِاعظمؒ کے پاس لے گیا اور انہیں بتایا کہ وہ کئی پونڈ خرچ کر کے ٹیکسی میں شہر سے آیا ہے۔ قائدِاعظمؒ نے اس سے ہاتھ ملایا،شکریہ ادا کیا لیکن کہا کہ مسلمان کو فضول خرچی نہیں ہونا چاہیے۔ یہی رقم تحریکِ پاکستان کے فنڈ میں دی جاسکتی ہے۔

فرقہ بندی سے نفرت

قائداعظمؒ فرقہ بندی سے سخت متنفر تھے۔1946ء میں ایک بار جمعہ کے روز وہ لندن میں تھے۔سوال پیدا ہوا کہ کس مسجد میں نماز جمعہ ادا کی جائے۔قائداعظمؒ نے فرمایا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقہ سے خاص نہ ہو اور جس میں امیر غریب سب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔مسجد میں گئےتو لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں کی صفیں خالی کر دیں تا کہ وہ سب سے آگے والی صف میں بیٹھ سکیں،لیکن قائداعظمؒ نے آخری صف میں بیٹھنا پسند کیا اور فرمایا:

"میں دیر سے آیا ہوں،اس لئے اگلی صف میں بیٹھنے کا مستحق نہیں ہوں۔"

نظم وضبط

قائدِاعظمؒ نظم وضبط کے معاملے میں سخت تھے۔گورنر جنرل بننے کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس دسمبر 1947ء میں طلب کیا۔خالق دینا ہال کے صدر دروازے پر انتظامات کی نگرانی کے لئے نواب صدیق علی خاں بطور سالارِ اعلیٰ نیشنل گارڈز اپنی وردی میں ملبوس قائداعظمؒ کا انتظار کر رہے تھےاور ہر ایک کا پاس داخلہ چیک کر رہے تھے،لیکن جب جانے پہچانے قائدِاعظمؒ بحیثیت گورنر جنرل اپنے اے ڈی سی صاحبان کے ہمراہ داخلہ کا پاس جیب میں

ڈالے جلوہ افروز ہوئے تو نواب صاحب نے آپ کا پاس داخلہ چیک کرنا خلاف ادب سمجھا۔ قائداعظمؒ ہال کے اندر داخل ہوئے اور تھوڑا فاصلہ طے کر کے ٹھٹک سے رک گئے اور نواب صاحب سے پوچھا: آپ نے مجھ سے ٹکٹ کیوں نہیں مانگا؟

نواب صاحب قائداعظمؒ کی اصول پسندی کو جانتے تھے، انہوں نے فوراً اپنی غلطی کا اقرار کرلیا۔ قائداعظمؒ نے فرمایا: آئندہ کبھی اپنے فرض میں کوتاہی نہ کرنا۔

خرچ میں احتیاط

وفات (11 ستمبر 1948ء) سے چند روز پیشتر ان کے معالج کرنل الٰہی بخش نے ان سے کہا: جناب! یہ سلکی لباس جو آپ نے پہن رکھا ہے، آپ کے لئے مضر ہے۔ آپ کو سردی لگ جانے کا خطرہ ہے۔

اس پر قائداعظمؒ نے کہا: فی الحال تو میرے پاس یہی سلکی لباس ہے لیکن میرا ارادہ ہے کہ میں چند جوڑے کھدر کے بھی بنوالوں۔

ڈاکٹر نے ان سے اتفاق نہ کیا اور کہا: سر! ٹھنڈے کپڑوں سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو گرم لباس کی ضرورت ہے۔ میں نے آپ کی اجازت کے بغیر تیس گز وانیلا (گرم کپڑے) کا آرڈر کراچی بھیج دیا ہے۔

یہ سن کر قائداعظمؒ ناراض ہوئے اور کہا: ڈاکٹر! آئندہ خرچ کے معاملے میں محتاط رہنا۔ جب بھی کسی چیز پر روپیہ خرچ کرو تو اچھی طرح سوچ لو کہ اس خرچ کی ضرورت ہے یا نہیں؟

اللہ سے تعلق

مولانا حسرت موہانی ایک بار بمبئی گئے۔ قائداعظمؒ سے ملنے کے لئے ان کو کوٹھی ماؤنٹ پلیزنٹ جا پہنچے۔ مولانا سے کون واقف نہ تھا، وہاں عزت احترام سے بٹھائے گئے۔ قائداعظمؒ کے سیکرٹری نے کہا کہ آپ تشریف رکھیں، ابھی قائداعظمؒ کی خدمت میں آپ کے آنے کی اطلاع بھجواتا ہوں۔ مولانا بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بلاوا آجانا چاہیے تھے لیکن بڑی دیر تک بلاوا

نہ آیا۔ مولانا تھوڑی دیر تک پہلو بدلتے رہے، پھر فوراً اپنی نشست سے اٹھے اور ٹہلنے لگے۔ برآمدے میں کبھی ایک طرف جاتے، کبھی دوسری طرف ٹہل ٹہل کر وقت گزار رہے تھے کہ اتفاقاً تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا اور کمرے کا پردہ اُڑا لے گیا۔ اب جو مولانا کی نظر پڑی تو جم کر رہ گئی۔ قائد مصلیٰ بچھائے مناجات میں مصروف تھے۔ ان کا سر سجدے سے اٹھتا ہی نہ تھا۔

مولانا خود بھی اللہ والے تھے اور رکوع اور سجدہ کی لذت سے خوب واقف تھے، جب دیکھا کہ قائداعظمؒ کا سر سجدے سے اٹھتا ہی نہیں تو آپ آگے بڑھ گئے اور اپنی نشست پر آ بیٹھے۔ اب ان کی سوچ کسی اور طرف نکل گئی۔ مولانا اس حال میں بیٹھے تھے کہ بلاوا آیا، وہ جھٹ اس کمرے میں پہنچے جہاں سجدہ ریزی کا منظر دیکھا تھا بولے :اللہ تعالیٰ سے تعلق کا جو منظر میں نے دیکھا ہے اس سے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔

قائداعظمؒ نے فرمایا: مولانا بس اب تو ایک ہی دعا ہے کہ جو قدم پاکستان کے لیے اُٹھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے کامیابی سے ہمکنار کر دے۔

قائداعظمؒ کی یہ دعا جو سجدہ ریزی کی حالت میں دل کی گہرائیوں سے نکلی تھی، قبول ہوئی اور 27 رمضان 1366ھ (مطابق 14 اگست 1947ء) کی مقدس رات لیلۃ القدر میں پاکستان وجود میں آ گیا۔

*****

قائدِاعظمؒ اور دفاعِ پاکستان

لیفٹیننٹ کرنل محمدالیاس (ریٹائرڈ)

...•••...

بانیٔ پاکستان قائدِاعظم محمد علی جناحؒ کی ہمہ گیر شخصیت ایک مسلمان مدبر اور اعلیٰ منتظم کا حسین مجموعہ ہے۔ایک مسلمان مدبر کی حیثیت سے وہ عسکری معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ عسکری حکمت عملی سے لے کر عسکری تربیت اور دیگر دفاعی امور تک ان کی معلومات بیش بہا تھیں۔تمام دفاعی امور پر بیک وقت نظر رکھنا اور ان سے متوقع نتائج اخذ کرنا آپ کی قائدانہ صلاحیتوں کا بیّن ثبوت ہے۔وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ افواج ریاست کا ایک اہم ستون ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ عسکری تقریبات میں بنفسِ نفیس شریک ہوتے اور دفاعی امور پر اظہارِ خیال کرتے۔کسی یونٹ کا دربار ہو، سٹاف کالج کے افسران سے ملاقات، یا خطاب ان کے لئے اس میں شمولیت خوشی کا موقع ہوتا۔ان تقریبات پر ان کا خطاب تاریخی اہمیت کا حامل ہے جس میں انہوں نے عسکری تنظیم کے راہنما اصول نہایت وضاحت سے بیان کئے ہیں جو مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔قائد کا افواج پاکستان سے خاص تعلق مختلف تقریبات میں کی گئی تقاریر ایک تاریخی حوالہ ہیں۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ قائدِاعظمؒ پاکستان کی مسلح افواج کی کیسے رہنمائی کرتے ہیں۔

21 فروری 1948ء کو ملیر میں پانچویں ہیوی اک اک اور چھٹی لائٹ اک اک رجمنٹوں کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے مضبوط دفاع کی اہمیت یوں واضح کی:

"جیسا کہ میں چند روز پہلے بحریہ کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہہ چکا ہوں، ہمارے لئے امن کے فروغ اور اقوامِ متحدہ کے نصب العین کی خاطر جدوجہد کا بہترین

طریقہ یہی ہے کہ ہم اپنے دفاع کو مضبوط بنالیں ۔اتنا مضبوط کہ کوئی طاقت ہمارے خلاف جارحانہ ارادے رکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے ۔ہم نے پاکستان کی آزادی کی جنگ جیت لی ہے لیکن آزادی کی حفاظت اور ملک کو زیادہ ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر تعمیر کرنے کی دشوار جنگ ابھی جاری ہے اوراگر ہمیں ایک عظیم قوم بن کر زندہ رہنا ہےتو یہ جنگ اس وقت تک لڑنا پڑے گی جب تک ہم آخری فتح سے ہمکنار نہیں ہو جاتے ۔قدرت کا اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہے گا جوزندہ رہنے کاسب سے زیادہ اہل ہے ۔"

"مضبوط دفاع کیا ہوتا ہے؟" اس سے بہتر انداز میں بیان نہیں کیا جاسکتا ۔اس اقتباس میں قابلِ غور نقطہ یہ ہے کہ" دفاع اتنا مضبوط ہوکر جارحانہ اقدام تو دور کی بات دشمن ہمارے خلاف جارحانہ ارادہ رکھنے کی جرأت بھی نہ کر سکے ۔"اس تقریر میں ایک اورنقطہ واضح کیا ہے جس کے بغیر دفاع مضبوط ہو ہی نہیں سکتا ۔قائدؒ فرماتے ہیں :

"اب آپ کو اپنی سرزمین کا محاذ بننا ہے تا کہ یہاں اسلامی جمہوریت و اسلامی سماجی انصاف اور انسانی مساوات قائم ہو اور نشوونما پا سکے ۔آپ کو چوکس رہنا ہے..... بہت ہی چوکس، کیونکہ ابھی آرام کا وقت نہیں آیا!"

بات یہاں ہی ختم نہیں ہوتی ۔قائدؒ نے مزید واضح کیا کہ، مقاصد کیسے حاصل کئے جاسکتے ہیں ۔فرمایا :"یاد رکھئے کوئی بھی قابلِ حصول چیز ایسی نہیں جسے آپ ایمان، تنظیم اورادائے فرض کی بےلوث لگن کے بل پر حاصل نہ کر سکتے ہوں ۔" قائدؒ فوج کے سربازو (ARM) کی اہمیت اوراس کے کردار سے پوری طرح آگاہ تھے ۔دوسری جنگِ عظیم کے معرکوں کے حربی نتائج ان پر واضح تھے ۔13اپریل 1948ء کو آرمرڈ کور سنٹر نوشہرہ میں افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے آمرڈ کور کی اہمیت اورتربیت پر یوں اظہارخیال کیا :"رسالے کو ہمیشہ فوج کا ہر اول دستہ سمجھا گیا ہے ۔یہ بات آج مشینوں کے عہد میں بھی اتنی ہی درست ہے جتنی گھڑسواروں کے زمانے میں تھی ۔رسالے کو اپنا منصب ادا کرنے کے لئے بہترین افسر اور

جوان درکار ہوتے ہیں ۔اس کا انحصار بہت بڑی حد تک آپ پر ہے کہ آپ اس اعلیٰ معیار تک پہنچتے ہیں یا نہیں ۔آپ رنگروٹ کو تیار کرتے ہیں اور اسے ایک تربیت یافتہ سپاہی بنا کر بھیجتے ہیں ۔آپ افسروں اور جوانوں کو اپنے مخصوص شعبہ دفاع کی جدید ترین فنی ترقی سے آشنا کرتے ہیں اور ایسی تعلیم وتربیت پر مجموعی طور پر آرمرڈ کور کی کارکردگی کا دارومدار ہے ۔"

قائدِاعظمؒ نے یہاں سنٹر کے عملے کے لئے ایک رہنما اصول کی نشاندہی کی جو کسی بھی تربیتی ادارے کے لئے یکساں اہم اور ضروری ہے، فرمایا: "آپ میں سے وہ لوگ جو سنٹر کے عملے میں شامل ہیں ، یادرکھیں کہ اصلاح وترقی کی گنجائش ہمیشہ رہتی ہے اور آپ کی کوشش و محنت پر بہت کچھ منحصر ہے ۔"

قائدِاعظمؒ نے اپنے خطاب میں ریٹائرڈ فوجیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا بلکہ بطور خاص ان سے مخاطب ہوئے اور فرمایا : "آپ نے اپنی عمر کے بہترین سال اپنے ملک کی خدمت میں صرف کئے ہیں ۔ ملک آپ کا ممنون ہے ۔یادرکھئے آپ نے فوج میں رہ کر دنیا دیکھی ہے اور شہریت کے فرائض کے بارے میں بہت کچھ سیکھا ہے ۔اب آپ اپنے گھروں میں رہ کر بھی اس علم اور تجربے کی اشاعت کر کے اور اپنے طریق زندگی کا نمونہ پیش کر کے اپنے ملک کی خدمت کا کام جاری رکھ سکتے ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ پاکستان کی ہر حکومت ریٹائرڈ فوجیوں اور شہیدوں کے لواحقین کا ہر ممکن حد تک خیال رکھے گی ۔"

قائدِاعظمؒ اچھا کام کرنے والے کی حوصلہ افزائی کرنے میں بخل سے کام نہ لیتے ۔سنٹر کی کارکردگی کو سراہتے ہوئے فرمایا : "آپ کا آغاز اچھا ہے اور آپ نے بہت کچھ کر دکھایا ہے جس شان کا آغاز ہے وہی شان برقرار رکھئے ،تو آرمرڈ کور کے لئے کامیابی ہی کامیابی ہے ۔"

عسکریوں کے لئے جن مخصوص اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے، قائدگاہے بگاہے افسروں اور جوانوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کراتے ۔13اپریل 1948ء کو تھرڈ آرمرڈ بریگیڈ رسالپور کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "قدیم رسالے کا شہسوار ثابت قدمی ،صبرو

ضبط، حوصلہ مندی، بردباری اور تیزی وطراری کے جن شاندار اوصاف کا مظاہرہ کیا کرتا تھا، وہ اب بھی آپ کے پیشِ نظر رہنا چاہیے"۔ آپ کا بریگیڈ پاکستانی فوج میں بلکہ درحقیقت پوری اسلامی دنیا میں اپنی قسم کا واحد بریگیڈ ہے۔ آپ کی منفرد حیثیت ایک ایسا اعزاز ہے جو دنیا کی سب سے بڑی مسلم مملکت کے شایانِ شان ہے۔"

15اپریل 1948ء کو پشاور میں 2/15 پنجاب مشین گن رجمنٹ کو نشان عطا کرنے کے موقع پر قائداعظمؒ کا خطاب خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ "یونٹ یا رجمنٹ فوج کی ایک ایسی اکائی ہے جو اپنے آپ میں مکمل ہوتی ہے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک اینٹ ہے اور فوج اس سے تعمیر شدہ عمارت۔ جو نقائص اینٹ میں ہوں گے، وہ عمارت میں ضرور نظر آئیں گے۔"

قائدؒ اس اینٹ کی اہمیت کو مکمل طور پر سمجھتے تھے۔ اس خطاب میں قائداعظمؒ نے ایک موثر، مضبوط اور مستحکم عسکری تنظیم کے خدوخال جس طرح بیان کئے ہیں، اس سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ دفاعی امور کو گہرائی تک سمجھتے تھے۔

اب یہ خطاب ملاحظہ کیجئے:

"آج کی یہ تقریب جس نے مجھے آپ کی رجمنٹ کو نشان پیش کرنے کا موقع دیا ہے، ایک اعزاز ہے اور کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں اس پر فخر محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کی سی رجمنٹ کی تشکیل و تعمیر کے لئے نہایت اعلیٰ صفات درکار ہوتی ہیں۔ مثلاً ڈسپلن کا بے پناہ احساس، وفا شعاری، ادائے فرض کی بے لوث لگن اور جسمانی شدائد کی برداشت۔ کوئی شخص ہر وقت اعلیٰ صفات کے متعلق سوچنے میں محو نہیں رہ سکتا۔ آیئے میں آپ کو ان صفات کا لب لباب ایک سیدھے سادے فقرے میں بتا دوں۔ وہ ہے اپنی قوم کے ساتھ وفاداری۔ اور پاکستان کا پرچم ایک علامت ہے، ایک یاد دہانی ہے اس بات کی کہ آپ کس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے آپ اپنی قوم کی نمائندگی کرتے ہیں۔" اور آخر میں قائدؒ نے ایک لاجواب جملہ کہا:

"محض الفاظ ہیچ (بے معنی) ہیں جب تک عمل نہ ہو۔"

یہ جملہ دراصل قائدؒ کے افکار کا نچوڑ ہے جس کا عکس ان کی زندگی میں نمایاں ہے۔

23 جنوری 1948ء کو پاک بحریہ کے ایچ۔ایم۔پی۔ایس دلاور کے عملے سے خطاب کرتے ہوئے مضبوط دفاع کو جارحیت کے خلاف ایک مضبوط فصیل قرار دیتے ہوئے فرمایا: ''پاکستان کو ہر افتاد اور خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے خود مستعد رہنا ہوگا۔اس ناقص دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے کہ کمزور اور دفاع سے محروم قومیں دوسروں کو جارحیت کی ترغیب دیتی ہیں۔ امن کی راہ ہموار کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ جو قومیں سمجھتی ہیں کہ ہم کمزور ہیں لہٰذا وہ ہم پر حملہ کی مشق کر سکتی ہیں۔اس وجہ تحریص کا خاتمہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ہم اپنے آپ کو اتنا طاقت ور بنا لیں کہ کسی کو ہمارے خلاف جارحیت کی مجال ہی نہ رہے۔''

پاکستان ائرفورس بیس رسالپور میں 13 اپریل 1948ء کو طاقت ور فضائیہ کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہوئے فرمایا: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو ملک طاقتور فضائیہ سے محروم ہو وہ کسی بھی حملہ آور کا نشانہ بن سکتا ہے۔پاکستان کے لئے لازم ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو، اپنی فضائیہ کی طاقت بڑھائے۔ہمیں ایک ایسی فضائیہ چاہیے جو کارگزاری اور مہارت میں بے مثال ہو اور پاکستان کے دفاع میں بری، بحری افواج کے شایانِ شان مقام حاصل کرے۔

ایک اور بات کہتا چلوں کہ قائدِ اعظمؒ کو افواج پاکستان بے حد عزیز تھیں۔قائدِ اعظمؒ 8 اگست 1948ء کو راولپنڈی تشریف لے جانے والے تھے لیکن علیل ہو جانے کی وجہ سے ان کو اپنا سفر ملتوی کرنا پڑا۔اس موقع پر انہوں نے افواج پاکستان کے نام ایک پیغام میں فرمایا کہ ''جس قدر جلد ممکن ہو، آپ کے پاس پہنچنے کا خواہش مند ہوں۔میرا دل آپ کے ساتھ ہے اگر میری علالت نے جسمانی طور پر مجھے آپ کے پاس آنے سے محروم نہ کر دیا۔''

سٹاف کالج کوئٹہ کے افسروں سے 14 جون 1948ء کو خطاب کرتے ہوئے افواجِ پاکستان کی ایک نہایت اہم ذمہ داری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا:

''یوں تو حلف ایک رسمی ضابطہ ہی ہے۔زیادہ اہم چیز تو حقیقی جذبہ اور دلی کیفیت ہے،

لیکن رسمی ضابطہ بھی اپنی جگہ اہم ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو پاکستان میں نافذ ہے۔ جب آپ زبان سے یہ الفاظ کہیں کہ آپ آئینِ پاکستان کے وفادار رہیں گے تو اس وقت آپ اس کے صحیح آئینی اور قانونی مضمرات کو بھی سمجھ رہے ہیں۔''

*****

پاکستان ضروری تھا

لیفٹیننٹ کرنل محمد اعظم (ریٹائرڈ)

...•••...

جس زمانے میں تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی، میری عمر کے لوگ سکولوں کے طالب علم تھے۔ نظریۂ پاکستان کے متعلق ہمارا علم اگرچہ اس زمانے میں محدود تھا مگر مسلم لیگ کے جلسے جلوسوں میں شمولیت ہم لوگ اپنا فرض سمجھتے تھے اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور ''پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الااللہ'' کے نعرے نوجوان نسل کے دل کی آواز بن گئے تھے۔ وہ طلباء جو ہم سے سینئر تھے اور کالجوں کے طالب علم تھے، ان ایام میں علی گڑھ اور دوسرے تعلیمی اداروں سے نکل کر پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔ جلسہ گاہوں اور مساجد میں اِن کی تقریریں سُن کر ہمیں بہت رشک آتا تھا۔ اکثر جی چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر ہم بھی اس جہاد میں شامل ہو سکیں تو کتنا اچھا ہو۔ مگر کم عمری اور دوسری مجبوریاں اِن ارمانوں کی راہ میں حائل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ 3 جون 1947ء کو اعلان ہو گیا کہ پاکستان جلد ہی معرضِ وجود میں آ جائے گا۔ یہ اعلان شام کی خبروں میں آل انڈیا ریڈیو سے ہوا تھا۔ اُسی روز قائداعظم محمد علی جناحؒ نے آل انڈیا ریڈیو سے اپنے خطاب کے اختتام پر پاکستان۔۔ زندہ باد! کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ریڈیو سیٹ بہت عام نہیں تھے۔ پورے گاؤں میں شاید دو تین سیٹ ہی ہوں گے، مگر ایک روز پورا علاقہ نعروں اور ہوائی فائرنگ سے گونج اٹھا۔ لوگ گھروں سے نکل آئے۔ سب سے زیادہ جذبات کی شدّت کا اظہار نوجوان کر رہے تھے جو قائداعظمؒ کی فوج کا ہراول دستہ تھے۔ معرضِ وجود میں آنے والا یہ خطّہ مسلمانانِ برِصغیر کے خوابوں کی تعبیر تھا۔ مگر میرا پاکستان ایک واقعہ نے میرے لئے ڈیڑھ دو سال پہلے بنا دیا تھا۔

واقعہ کچھ یوں تھا کہ پاکستان معرضِ وجود میں آنے سے چند سال قبل میرے والد سرکاری ملازمت کے سلسلے میں ایک چھوٹے سے شہر میں تعینات تھے۔گرمی کی چھٹیوں کے دوران میرے والد صاحب کا تبادلہ ہوگیا اور ہم دوسرے شہر چلے گئے۔سکول بند تھے،اس لئے نئے سکول میں داخل ہونے کے لئے سکول چھوڑنے کا سرٹیفکیٹ پرانے سکول سے چھٹیوں کے بعد ہی حاصل کیا جاسکتا تھا۔پچھلے سکول میں دو سال زیرِ تعلیم رہنے کے دوران ایک ہندو ہم جماعت نرائن، جو میرا ڈیسک فیلو تھا،میرے قریبی دوستوں میں سے تھا۔نرائن کے والد شہر کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔یہ گھرانہ پڑھے لکھے افراد پر مشتمل تھا۔سکول کھلنے کے بعد میں نے نرائن کو لکھا کہ میں فلاں روز اپنا سرٹیفکیٹ لینے آؤں گا تو ملاقات رہے گی۔جس روز میں سرٹیفکیٹ لینے آیا،نرائن کا اصرار تھا کہ میں دوپہر کا کھانا ان کے گھر کھا کر جاؤں۔اس نے مجھے بتایا کہ وہ صبح گھر پر کھانے کا کہہ آیا تھا اس لئے کھانے کے لئے میرا رکنا ضروری ہوگا۔نرائن سے دو سال تک میری دوستی رہی،مگر اس کے گھر کھانے پینے کا موقع کبھی نہیں آیا۔اکثر باہر سے ہی گھنٹی بجا کر یا آواز دے کر اسے بلالیا جاتا تھا۔اس کے گھر کے افراد مجھے جانتے تھے۔اس روز نرائن کے گھر کچھ کھانے کا میرا پہلا موقع تھا۔

ہم دونوں سکول سے ان کے گھر آئے۔کچھ دیر کے بعد نرائن نے کہا کہ کھانا تیار ہے۔اگر چاہو تو چن دیا جائے۔ہم باہر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔کھانا گھر کے اندر سے ان کے پڑوس میں رہنے والا ایک غریب مسلمان ہمسایہ جسے میں جانتا تھا، اٹھا کر لایا اور میرے آگے رکھ دی۔نرائن اس دوران اندر آتا جاتا رہا۔مسلمان پڑوسی جس کا نام رفیق تھا میرے کھانے کے دوران بیٹھا رہا۔رفیق کی مسلسل موجودگی اور نرائن کے میرے ساتھ کھانے میں شامل نہ ہونے نے مجھے کچھ پریشان کئے رکھا۔جونہی نرائن اندر گیا،میں نے رفیق سے پوچھا کہ تمہیں اس سے پہلے تو کبھی اُن کے گھر میں نے کام کرتے نہیں دیکھا،ان کے تو اپنے کافی نوکر چاکر ہیں،تم کیسے آئے ہو؟ رفیق کہنے لگا کہ سیٹھ کے گھر سے آج صبح مجھے یہ پیغام آیا تھا کہ اُن کے ہاں دوپہر کے

کھانے پر ایک مسلمان مہمان آ رہا ہے جس کے لئے تم اپنے برتن لے کر آ جانا۔ آپ کے آنے پر میں برتن لے کر آ گیا۔ کھانا میرے برتنوں میں ڈالنے کے بعد سیٹھ کے گھر والوں نے تاکید کی کہ کھانے کے بعد میلے برتن واپس اندر نہ لے آنا بلکہ وہ برتن باہر سے ہی اپنے گھر لے جانا۔

یہ میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا اور مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ ہم ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے۔ آٹھویں جماعت کے تیرہ چودہ سالہ طالب علم کے طور پر میرا واپسی کا سارا سفر اس سوچ میں کٹا کہ میں نرائن کے برتنوں میں کیوں کھانا نہیں کھا سکتا؟ نرائن میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کیوں نہیں کھا سکتا؟ آخر یہ فرق کیوں؟ اور اسی ادھیڑ بن نے جلد ہی پاکستان کا مطلب اور اس کی ضرورت مجھ پر منکشف کر دی۔

اس بات کو آج طویل عرصہ ہو گیا، مگر مجھے پاکستان کا مطلب اور اس کی ضرورت سمجھنے میں آج تک کبھی کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

*****

کشمیر کا بھارت سے الحاق

ملک ممتاز اقبال

...•••...

منصوبہ تقسیم برصغیر کے کئی حصے تھے۔ایک حصے کا تعلق دیسی ریاستوں سے تھا۔منصوبے میں اس بات کا وضاحت سے اظہار کر دیا گیا تھا کہ دیسی ریاستیں یہ فیصلہ کرنے میں خودمختار ہوں گی کہ وہ پاکستان کے ساتھ شامل ہوں گی یا ہندوستان کے ساتھ، یا پھر آزاد اور خودمختار رہیں گی۔ اس شق کی بدولت ریاستوں کے حکمرانوں کو امید تھی کہ وہ حق حکومت حاصل کرلیں گے۔ایک سال پہلے وزارتی مشن نے بھی اپنے مشہور ومعروف منصوبے میں ریاستوں کے بارے میں ایسا ہی تجویز کیا تھا۔

یہاں دارالامرا (ہاؤس آف لارڈز) میں 17 جولائی 1947 کو کی جانے والی لارڈ لسٹول (Listowel) کی تقریر کا حوالہ دیا جارہا ہے جو ان دنوں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا تھے:

"اے اُمرا کرام! آپ کو یاد ہوگا کیبنٹ مشن نے 12 مئی 1946 والی یادداشت (میمورنڈم) میں ریاستوں کو آگاہ کیا تھا کہ بادشاہ سلامت کی حکومت کسی صورت میں بھی اقتدار اعلیٰ حکومت ہند کو منتقل نہیں کرے گی۔ہم اس بیان پر قائم ہیں۔جونہی شاہی نمائندے (وائسرائے) کی تعیناتیاں اور اس کے فرائض اور اس طرح کے افسروں کی تعیناتیاں اور فرائض ختم ہوں گے، تو ریاستیں خود اپنے جملہ اختیارات کی مالک بن جائیں گی۔بادشاہ سلامت کی حکومت ذرہ بھر دباؤ نہیں ڈالے گی اور ان کے اس عظیم تاریخی اور اپنے مرضی پر مبنی فیصلے کو متاثر نہیں کرے گی۔"

سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کے اس بیان سے فقط پانچ دن پہلے خود برطانوی وزیر اعظم

ایٹلی (Attlee) نے بڑے واضح الفاظ میں پارلیمنٹ کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ جب معاہدات اور اتفاقیات (Treaties /Agreements) کا خاتمہ ہوجائے گا تو ریاستیں دوبارہ آزاد ہوجائیں گی۔

یہ تو ظاہری بات تھی، لیکن پس پردہ کوئی اور ہی ڈراما کھیلا جارہا تھا۔ وزارتی مشن کے منصوبۂ تقسیم کے بالکل برعکس برطانیہ کا شہنشاہی نمائندہ ماؤنٹ بیٹن اپنے خصوصی دوست پنڈت نہرو کو یقین دلا چکا تھا کہ ریاستوں کو ان کی مرضی نہیں کرنے دی جائے گی۔ کیمبل جانسن کے بقول، پنڈت نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے التجا کی تھی کہ اگر تقسیم ہند ناگزیر ہوجائے تو وائسرائے ازراہِ کرم ریاستوں پر دباؤ ڈالے کہ وہ بھارت میں شامل ہوں۔ پنڈت نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے مابین یہ پیمان 10 مئی 1947ء کو وجود میں آچکا تھا جبکہ تقسیم کے منصوبے کا اعلان 3 جون کو ہوا، دوسری طرف انگلستان میں سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہند اور وزیر اعظم برطانیہ ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں کو یقین دلائے جارہے تھے کہ ان کے تاریخی اور ان کی مرضی پر مبنی فیصلے کو ہرگز اور ذرہ بھر بھی متاثر نہیں کیا جائے گا۔ پھر ماؤنٹ بیٹن اور نہرو کے باہمی پیمان کی روشنی میں دیکھیں تو برطانوی منصوبۂ تقسیم کی ریاستوں کے متعلق اس شق کی کیا اہمیت رہ جاتی تھی۔ یہ محض دھوکا تھا، سراسر دھوکا۔

سب کو معلوم ہے کہ کانگریس کوئی بھی فیصلہ مسٹر گاندھی کے علم میں لائے بغیر نہ قبول کرتی اور نہ رد کرتی تھی۔ اس بات کا معنی واضح ہے کہ دیسی ریاستوں کے باب میں فریب کا جو جال بنا جارہا تھا اسے گاندھی کی پوری پوری تائید حاصل تھی اور یہ کہ گاندھی اور ان کے چیلوں نے منصوبہ تقسیمِ ہند کھلے دل سے تسلیم نہیں کیا تھا، بلکہ ذہنی تحفظات کے ساتھ تسلیم کیا تھا، محسوس یہ ہوتا ہے کہ درپردہ خود برطانوی حکومت کا بھی یہی موقف تھا، وگرنہ ماؤنٹ بیٹن کا عمل مختلف ہوتا۔ برطانوی حکومت بنیادی طور پر تقسیمِ ہند کے خلاف تھی اس ضمن میں برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی کے اعترافات ان کی کتاب (A Prime Minister Remembers)

''ایک وزیر اعظم کو یا د ہے'' میں شامل ہیں ۔ ایٹلی نے لکھا کہ اس نے تقسیم ہند کے اصول کے ساتھ اتفاق کیا تھا، اور اتفاق اس لئے کیا گیا کہ دس کروڑ مسلمانانِ ہند کی بھاری اکثریت اڑ گئی تھی کہ وہ اپنے لئے ایک آزاد، خود مختار وطن لے کر ہی رہیں گے ۔ کوئی اور منصوبہ انہیں مطمئن نہیں کرسکتا.....''

اگر برطانوی حکومت کا برصغیر ہند کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے کے متعلق ناگواری کا رویہ ایسا تھا تو پھر ظاہر ہے کہ وہ برّ عظیم کی سابق قوت اور وحدت کو مزید ٹکڑے کرنے کی اجازت کیسے دے سکتا تھا۔

ڈاکٹر ڈبلیو سی سمتھ اس ضمن میں کسی شک میں مبتلا نہ تھے ۔ ان کا بیان ہے کہ ''برطانیہ کو جب تک ہندوستان پر حکومت کرنا تھی، اس کے لئے اندرونی طور پر مُنقسم ہندوستان ہی مفید تھا اور یہ اصول کہ تقسیم کرو اور حکومت فرماؤ، بالکل بجا تھا۔ لیکن برطانیہ والے ہندوستان کو چھوڑتے وقت اس کے ٹکڑے نہیں کرنا چاہتے تھے ۔ کیونکہ مُنقسم برِ عظیم انہیں کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا۔ وہ جنوبی ایشیا میں ایک ''متحد اور دوست ہندوستان'' چھوڑ کر جانا چاہتے تھے جو شمالی کمیونسٹ یلغار کا مقابلہ کرسکنے کے قابل ہو۔''

3 جون کے منصوبہ تقسیم کے اعلان میں یہ واضح ہو جانے کے بعد کے منظر نامے یعنی ہندوستان کی تقسیم ہوگی اور ریاستوں کو خود مختاری ملے گی، سب سے پہلے ٹراونکور نے آزادی کا اعلان کیا اس کے بعد حیدرآباد نے یہی قدم اٹھایا اور پھر جے پور جیسی اہم ریاست نے بھی یہی کیا۔

اس پر کانگریس بہت غصے میں تھی ۔ مسٹر گاندھی اپنے تمام تر وعدوں کے باوجود ایسے بیان جاری کر رہے تھے جو وزیر اعظم ٹراونکور سی پی راما سوامی اور نظام حیدرآباد کو تلخ باتیں کہہ رہے تھے ۔ یہیں بس نہیں، انہوں نے 15 جون کو دلی میں ایک بڑے جلسۂ عام سے خطاب کیا اور واضح کیا کہ جو ریاست آزاد رہنے پر اصرار کرے گی اسے ہندوستان کے خلاف برِ سرِ جنگ تصور کیا جائے گا۔

جب اس پر ریاستوں نے کوئی پروا نہیں کی، تو مسٹر گاندھی نے وزرا سے ملاقات کر کے

کہا کہ وہ ریاستوں پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کریں۔وائسرائے نے ان تمام اہلیانِ ریاست کو بلا کر یہ حکم سنایا کہ اپنے مستقبل کا فیصلہ خوب سوچ کر اپنا نفع نقصان سامنے رکھ کر کریں جس طرح تمہیں حکومت ہندوستان کا سامنا کرنا ہوگا، اسی طرح اپنی رعایا کے غم وغصے سے لبریز ردِعمل کا سامنا بھی کرنا ہوگا۔

تری پورہ کے حکمران نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کیا۔تری پورہ میں بھاری اکثریت مسلمان تھی۔حکمران نے انہیں فوجی قوت سے کچل دیا۔13 جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی (سیز فائر) کا نفاذ عمل میں آیا (یعنی گاندھی کے قتل سے ایک سال بعد) تو پنڈت جواہر لال نہرو نے لوک سبھا میں اعلان کیا کہ "کشمیر میں جو کچھ بھی کیا گیا تھا وہ گاندھی جی کی بھرپور اشیرباد سے کیا گیا۔" مسٹر کاربل اپنی کتاب "کشمیر میں خطرہ" (DANGER IN KASHMIR) میں لکھتا ہے کہ اچاریہ کرپلانی مہاراجہ کشمیر کو اپنی ریاست کا ہندوستان سے الحاق کرنے کی ترغیب دینے کے لئے کشمیر گیا۔کرپلانی کے بعد مہاراجا پٹیالہ، مہاراجا کپورتھلہ اور مہاراجا فرید کوٹ کشمیر گئے۔ان سب کو گاندھی کی تائید حاصل تھی۔ان دنوں مسٹر کرپلانی کانگریس کے قائم مقام صدر تھے۔ماؤنٹ بیٹن خود بھی کشمیر گیا۔چار دن کشمیر میں ٹھہرا رہا اور مہاراجا سے تین ملاقاتیں کیں۔مہاراجا ڈرتا تھا کہ ریاست میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے۔اسے بغاوت کا خطرہ تھا، لہٰذا وہ الحاق کے معاہدے پر دستخط کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہوا۔ادھر ماؤنٹ بیٹن چاہتا تھا کہ مہاراجہ 14اگست 1947ء سے پہلے پہلے الحاق کا فیصلہ کرڈالے کیونکہ ماؤنٹ بیٹن کو خطرہ تھا کہ جتنی دیر ہوگی اتنی ہی مشکلات اور پیچیدگیاں بڑھیں گی۔اس کا یہ خیال ہندوستانی مفاد کی رُو سے درست تھا۔

یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ مہاراجہ نے بھارت کے ساتھ کشمیر کے الحاق کا کوئی معاہدہ سرے سے کیا ہی نہیں۔مشہور مورخ الیسٹر لیمب (ALASTAIR LAMB) نے اپنی کتاب "ایک

المیے کا ظہور۔ کشمیر 1947ء (BIRTH OF A TRAGEDY - KASHMIR 1947) میں صاف صاف لکھا اور ثابت کیا ہے کہ بھارت سے کشمیر کا الحاق ہوا ہی نہیں۔ بھارت نے کشمیر پر فوجی قبضہ کیا۔ اگر الحاق کی کوئی دستاویز ہوتی تو بھارت دنیا میں ہر اُس پلیٹ فارم پر لہرا لہرا کر دکھاتا جہاں کشمیر پر بھارتی قبضے کی وجہ سے بھارت کی مذمت کی جاتی ہے۔

پھر گاندھی خود کشمیر گئے۔ مسٹر برڈ وڈ (Birdwood) کے بقول وہ یکم اگست 1947ء کو سرینگر پہنچے، وہاں تین دن مقیم رہے اور پھر ایک رات جموں میں گزاری۔ شاید گاندھی اور ماؤنٹ بیٹن دونوں کے ذہن سے اتر گیا تھا کہ انہوں نے والیانِ ریاست کو متصل ڈومینین اور رعایا کی خواہشات کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ بلکہ والیانِ ریاست کو رعایا کی خواہشات کے باب میں ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ یہاں اس امر کا ذکر بے جا نہ ہوگا کہ جولائی کے نصف آخر میں قائدِ اعظمؒ نے مختصر سی تعطیل گزارنے کے لئے کشمیر جانا چاہا، تو حکومتِ کشمیر سے اجازت چاہی، مگر حکومتِ کشمیر اجازت دینے پر رضامند نہ ہوئی۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ مہاراجا نے ہزاروں کی تعداد میں جن سنگھی غنڈے اور قاتل منگوا لئے تھے۔ ادھر بھارتی حکومت نے پوری رازداری کے ساتھ ایک سڑک تعمیر کر لی جو پٹھان کوٹ کے راستے کشمیر کو بھارت سے ملا سکتی تھی۔ اس کے ذریعے گولہ بارود اندھا دھند تیزی کے ساتھ سرینگر اور جموں میں بھیج دیا گیا۔ صوبہ جموں میں مسلم آبادی کے قتل و غارت کا آغاز ہو گیا۔ مہاراجا کی اس حرکت کے باعث ریاست میں بغاوت نے سر اٹھایا اور قبائلی پٹھانوں نے اپنے بے بس اور مظلوم برادرانِ اسلام کی مدد کے لئے کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ جب لڑائی شروع ہو گئی تو لندن کے معروف اخبار ''دی ٹائمز'' نے تبصرہ کیا:

''آثار بتاتے ہیں کہ مہاراجا کشمیر سر ہری سنگھ پر گاندھی اور بعض دیگر کانگریسی لیڈروں کی ترغیبات جو انہوں نے تین ماہ قبل کشمیر میں جا کر پیش کی تھیں، اثر انداز ہوتی جا رہی ہیں''
(2 نومبر 1947ء)

اس بات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے قتل کے چند ہفتے بعد لوک سبھا میں خطاب کرتے ہوئے بتایا تھا کہ کشمیر کے ضمن میں جو کچھ بھی کیا گیا تھا، اس میں گاندھی کی بھرپور حمایت اور تائید شامل تھی۔ گاندھی 13 جنوری 1948ء کو قتل کر دیئے گئے۔ گاندھی جی نے اپنی وفات کے وقت کے اپنی تبلیغات اہنسا کی اس کامیابی پر بڑے اطمینان کے سانس لئے ہوں گے۔ کیونکہ وہ اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑے جا رہے تھے جو ان کی روش کو سمجھنے کی اہلیت رکھتی تھی اور جو ان کی بھرپور پیروی کر سکتی تھی۔

*****

فکرِ اقبال

پروفیسر حسنین کاظمی

...•••...

برِ صغیر کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ (تعمیر و ترقی کا نیا کام) کا دور سیاسی اعتبار سے ان کے دورِ غلامی کے ساتھ ہی ظہور پذیر ہوتا نظر آتا ہے۔ نشاۃِ ثانیہ کا تعلق دل کے احساس اور ذہن کے رویے سے ہوتا ہے اور اس کے لئے اہلِ دل اور اہلِ فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری تاریخ میں ایسے اہلِ دل اور صاحبانِ فکر و نظر میں دو نام ایسے ہیں جنہوں نے شعر کی تاثیر کو اپنے اجتماعی مقاصد کے حصول کا وسیلہ بنایا۔

یہ دو نام مولانا حالیؒ اور علامہ اقبالؒ کے ہیں۔

مولانا حالیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں کے پیشِ نظر بہت بلند اور اعلیٰ اجتماعی مقاصد تھے۔ قدرت نے اُنھیں عمدہ ذہن اور شعر و نثر کی جو نعمت عطا کی تھی، اسے انہوں نے اپنے مقصد کا پابند بنایا۔ اس سے فائدہ علم و ادب کو بھی پہنچا اور قوم کو بھی۔

برِ صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو اسلام میں فکری اجتہاد کا سلسلہ حضرت شاہ ولی اللہؒ سے شروع ہوتا ہے۔ دراصل ایک ضابطہ زندگی کی حیثیت سے اسلام میں داخلی طور پر بے حد و حساب توانائی موجود ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم احکاماتِ قرآنی کے مطابق تدبر و تفکر سے کام لیتے رہیں۔ دل کی گہرائی سے اسلام پر ایمان خود صاحبِ ایمان کے قلب میں ایسی وسعت، نگاہ میں ایسی پاکیزگی اور رویے میں ایسی شانِ بے نیازی پیدا کر دیتا ہے کہ پھر شخصی توصیف و تنقید یا کششِ منفعت اور اندیشۂ زیاں اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کر سکتے۔ احکامات اور ارشاداتِ قرآنی اور تعلیماتِ نبوی ﷺ پر ہم جتنا غور کریں گے،

ہمیں ہر زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے فکر وعمل کی روشنی میسر آتی چلی جائے گی۔

برِ صغیر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ آزمائش کا دور وہی تھا جسے ہم دورِ غلامی سے تعبیر کرتے ہیں۔انگریزوں نے اندازہ کرلیا تھا کہ یہاں ان کو حقیقی مزاحمت کا سامنا صرف مسلمانوں کی جانب سے ہوگا لہٰذا اپنی حکمتِ عملی میں انہوں نے یہ مقصد سرِ فہرست رکھا کہ مسلمانوں کو ایمانی اور اقتصادی، دونوں پہلوؤں سے مجروح کیا جائے۔

بے بسی اور بے کسی کی اس کیفیت اور ان شدید نا مساعد حالات میں برِ صغیر کے مسلمانوں کو پہلی مرتبہ واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ ان کی اجتماعی حیثیت کا تسلیم کیا جانا ضروری ہے ورنہ انگریزوں کی دشمنی اور ہندوؤں کی عددی کثرت کی وجہ سے وہ بے نام اور بے مقام ہو کر رہ جائیں گے۔برِ صغیر کے وجودِ اجتماعی کے تسلیم کیے جانے کی داستان ہے اور اس کی فکری بنیادیں استوار کرنے میں علامہ اقبالؒ نے اپنے افکار سے بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر بہت بڑا مقصد تھا۔عظیم مقصد کے لئے ایمان اور اخلاق عمل ہی وسیلہ بن سکتے تھے۔میں عمل کا حوالہ اس لیے دے رہا ہوں کہ ان کے لئے شاعری اور مقالہ نگاری ہی ان کے عمل کے میدان تھے۔ان کی کامیابی یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کو ایک بڑے تعمیری مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔وہ مختلف وادیوں میں نہیں بھٹکے بلکہ اپنے فکر وفن کو اپنے ایمان کے تابع کرلیا۔برِ صغیر کے مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ میں علامہ اقبالؒ کی اہمیت کے لئے ان کے فکر وفن کے بعض اہم نکات پر توجہ ضروری ہے۔ان کا کامل یقین یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کے لیے دین صرف اسلام ہے۔انہوں نے خطبۂ آلہ آباد میں ایک جگہ کہا ہے: "قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناں گوں روابط کا ایک اعلیٰ اور برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔تعلیماتِ قرآنی کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیشِ نظر اسلام پر ایک علمی اور تعلیمی قوت کی حیثیت سے بطورِ مجموعی تبصرہ کرتے ہوئے گوئٹے نے ایکرمین سے کہا تھا کہ "تم نے دیکھا کہ ان (اسلامی) تعلیمات میں کوئی کمی نہیں۔اپنے تمام علمی اور فنی وسائل کے

باوجود ہم یا کوئی بھی دوسرا انسان اس سے آگے جا ہی نہیں سکتا۔"

علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی زندگی میں ایمان ویقین کی اہمیت کو واضح سے واضح تر کیا:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اسلامی نظام فکر کا محور تصور توحید ہے۔توحید پر ایمان کے نتیجے میں معاشرتی وحدت اور احترام آدمیت ضروری ہے۔توحید پر ایمان انسانی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہے اوراس سے انسانی زندگی پر ہمہ گیر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

توحید پر ایمان ہماری شخصی اور اجتماعی، دونوں زندگیوں کے ہر عمل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسے اثرانداز ہونا چاہیے لیکن اس کی مکمل تشریح ہمارے ہادی برحق ﷺ نے فرمائی کہ توحید پر ایمان کے سماجی مضمرات کیا ہیں۔علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ

از کلیدِ دیں درِ دُنیا گشاد
ہمچو او بطنِ اُمِ گیتی نزاد

یعنی ہمارے رسول کریم ﷺ نے دین کی کنجی سے دنیا کا دروازہ کھولا اوراس زمین اور کائنات نےان کی عظمت کا ہم پلہ کوئی دوسرا انسان پیدا نہیں کیا۔

معاشرتی وحدت کے اظہار کے لئے ایک ریاست ضروری ہے۔ہمارے آقا ﷺ نے اہل مکہ کی جانب سے بادشاہت کی پیش کش یکسر مسترد کر دی اوراسلامی نظام کے قیام کا ایک عملی نمونہ پیش فرمایا۔اس معاشرے میں عقیدۂ توحیدایک زندہ معاشرتی قوت کی طرح کار

فرمانظر آتا ہے یعنی انسانوں پر اللہ کے قانون کی بالادستی تاکہ ہر انسان کی چھپی ہوئی صلاحیتیں گلشنِ آدمیّت کے پھول، پھل بن کر عالمِ انسانیت کے لئے سامانِ حیات کی صورت نکھر کر سامنے آجائیں۔

علامہ اقبالؒ نے برِصغیر کے مسلمانوں کے سامنے عالمگیر ملّی وحدت کی بنا پر جداگانہ قوم کا جو تصور پیش کیا جو آگے چل کر قیامِ پاکستان کا باعث بنا، وہ کسی تعصّب یا محدود منفعت کی بنیاد پر نہیں تھا بلکہ وہ اسلام کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ کی توحید پر یقینِ محکم کا لازمی تقاضا تھا۔اس ایمان کے بعد انسان جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کے قیام کو اپنا مقصد بناتا ہے۔

قرآن پاک نے ہمارے حضور ﷺ کی بعثت کی ایک اہم وجہ یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اس دور میں بحر و بر میں فساد پیدا ہو گیا تھا۔اس فساد میں نسل، رنگ، قبیلے اور علاقے کے تعصّبات شامل تھے۔حضور پاک ﷺ نے انسانوں کے سامنے وحدتِ ملّی کا جو عملی نمونہ پیش فرمایا، اس میں صہیب رومیؓ، سلمان فارسیؓ اور بلال حبشیؓ شامل تھے۔

اسلام نے ہمارے سامنے دو اصول بنیادی عقیدے کے طور پر پیش کئے ہیں۔پہلا احترامِ آدمیت کا اصول یہ کہ

باخبر شو از مقامِ آدمی
آدمیت احترامِ آدمی

(مقامِ آدمی سے آگاہی پاؤ کہ احترامِ آدمی ہی کا نام آدمیّت ہے)

یہ اصول اس ارشادِ قرآنی کے مطابق ہے کہ

''ہم نے بنی آدم کو احترام عطا کیا اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سے مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔''

اور دوسرا اخوتِ ایمانی کا اصول۔اقبالؒ فرماتے ہیں:

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پُر فشاں ہو جا

یہ تفسیر ہے قرآن پاک کے اس ارشاد کی کہ "سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور تفرقے میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ تمہارے سامنے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آ جائے (3/103)"

یہ ہیں وہ بنیادی اصول جن کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ وحدت قرار دیا اور کہا کہ ان کو اپنے ضابطۂ حیات کے مطابق اپنے معاشرے کی تشکیل کے لئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی ضرورت ہے۔ ہمارا مسئلہ صرف آزادی کا حصول نہ تھا بلکہ ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ اس مملکت میں اسلامی اصولوں کے مطابق ایک نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کریں۔ اب ہم نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا، یہ باتیں اس وقت ہماری گفتگو کا موضوع نہیں ہیں لیکن یہ کہنا بہر حال اظہارِ حقیقت ہے کہ حصولِ آزادی کے سب سے بہتر مقاصد ہمارے دین کے اجزائے ترکیبی ہیں یعنی حرّیت، اخوت، مساوات، عدالت، امانت اور دیانت۔

ہمارے ہادیٔ برحق ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے منسوب اِن اصولوں پر ایک نظامِ معاشرت قائم کیا تھا۔ ہمارے سامنے وہی معیارِ فکر و عمل ہے۔ حریت میں شخصی آزادی اور احترامِ آدمیت

شامل ہیں ۔مساواتِ انسانی کا تصور اسی اصول کی بنا پر ایک سماجی حقیقت بن سکتا ہے ۔اخوت مسلمان کے لئے جزوِ ایمان ہے ۔عدالت اس نظام ارض وسما کی تخلیق اور اس کے قیام کا سبب ہے ۔امانت اور دیانت اس عدالت کو انسان کی معاشرتی زندگی میں قائم کرنے اور قائم رکھنے کا وسیلہ ہیں ۔علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا تھا جب انہوں نے کہا:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا ، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؒ دورِ غلامی میں ہندی مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ ان کو صرف آزادی ہی حاصل نہیں کرنی بلکہ آزادی اور احترامِ آدمیت کی راہ پر عالمِ انسانیت کی رہنمائی بھی کرنی ہے ۔انتہائی تاریک دور اور نامساعد حالات میں بلندترین مقاصد کی جانب پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ اشارہ محض خواب یا خیال کی باتیں تھیں۔اس میں ارشاداتِ قرآنی پر عمل پیرا ہونے کا درس بھی شامل تھا۔ مکے میں قبل از ہجرت مسلمانوں کی بظاہر نہایت کمزور کیفیت تھی۔انہوں نے مدینے میں جب ایک شہری مملکت قائم کی تو بھی ان کی کمزور حیثیت فوری طور پر تبدیل نہیں ہوئی تھی بلکہ اسی بنا پر اہلِ قریش نے ان پر دوسری ہجری سال ہی میں بھرپور حملہ کیا تھا تا کہ اپنی دانست میں، وہ ان کو نیست و نابود کر دیں ۔قرآن پاک نے مسلمانوں کی اس کمزور حیثیت کی طرف بھی اشارہ کیا اور پھر ان کی ذمہ داری بھی یاد دلائی ۔سورۂ انفال میں ارشاد ہوا:

"یاد کرو وہ وقت جبکہ تم تھوڑے تھے، زمین میں تم کو بے زور سمجھا جاتا تھا تم ڈرتے تھے کہ کہیں لوگ تمہیں مٹا نہ دیں ۔اس پر اللہ نے تم کو جائے پناہ بنا کر دی۔ اپنی مدد سے تمہارے ہاتھ مضبوط کیے اور تمہیں اچھا رزق پہنچایا تا کہ تم شکر گزار بنو" (سورۃ الانفال ۔آیت 26)

اسی سورۂ مبارک میں آگے چل کر یہ بھی فرمایا گیا :"جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا" (سورۃ الانفال ۔آیت 73)

ان ارشادات باری تعالیٰ کی روشنی میں دیکھئے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں برِصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا مفہوم کیا تھا اور وہ جب کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے دنیا کی امامت کا کام لیا جائے گا تو اس سے ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں مسلمانوں کی عالمی امامت کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان دنیا کے تمام غیر مسلموں پر اپنی حکمت قائم کرلیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ انسانیت کو اجتماعی طور پر قوانین کا تحفظ حاصل ہو جائے۔ یہی سنتِ نبوی ﷺ کی پیروی ہے۔

جس کے پاس حکومت ہوتی ہے اختیار رہوتا ہے اقتدار رہوتا ہے، اس کے پاس عملاً سب کچھ ہوتا ہے۔ ایسا ہمہ گیر اختیار اگر احتساب پر یقین کے بغیر حاصل ہو جائے اور اگر وہ جذباتیت، خواہش پرستی اور مفادات کے حصول اور تعصّبات اظہار کا وسیلہ ہے کہ پھر بڑی تباہی پھیلتی ہے۔ ایسے معاشرتی مشاورتی علامت فرعون ہے 'میں ہی تو تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں' کا نعرہ لگاتا تھا۔ ایسی ذہنیت انسانوں میں نہ جانے کتنے گروہ پیدا کردیتی ہے اور ہر گروہ کو دوسرے گروہ کا دشمن بنادیتی ہے۔

مرزا رجب علی بیگ سُرور کی مشہور تصنیف فسانۂ عجائب کا ایک کردار شہزادی ماہ طلعت ہے۔ سُرور صاحب نے شہزادی ماہ طلعت کو انتہائی بنا سنوار کر آئینے کے سامنے بٹھایا اور اس کی اپنی زبان سے نخوت اور خود پسندی کی شدت کا اظہار اس مصرعے کے ذریعے کرایا:

"دیکھ آئینے کو کہتی تھی کہ اللہ ری میں"

شہزادی نے اپنے حسن کو لازوال سمجھا اور آئینے کے سامنے بیٹھی تو "اللہ ری میں" کہا۔ کوئی دولت کے آئینے میں دیکھ کر اللہ رے میں کہتا ہے، کوئی اقتدار کے آئینے میں خود کو دیکھتا ہے تو اس کے دل کی زبان سے یہی الفاظ نکلتے ہیں کہ اللہ رے میں۔ کوئی اپنی خاندانی وجاہت پر نگاہ کرتا ہے تو کہتا ہے اللہ رے میں۔ بس یہی وہ ذہنیت ہے جس سے فساد پھیلتا ہے۔ اس لئے قرآن پاک میں ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اختیار ملے تو عدل سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے

لئے اپنی ہدایت نازل کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ اس سے بااختیار انسانوں کے لئے راہِ عدل کی نشاندہی ہوتی ہے۔

خواجہ غلام السیّدین کے نام اپنے ایک خط میں علامہ اقبالؒ نے لکھا تھا کہ ''علم کے ذریعے انسان کو جو طبعی قوت ہاتھ آئی، اگر وہ دین کے ماتحت نہ رہے تو محض شیطانیت ہے۔'' تعلیماتِ اسلامی کی رُو سے اقبالؒ اقتدار کو بھی انسان کے پاس دوسرے انسانوں کی فلاح کے لئے اللہ کی امانت تصور کرتے ہیں۔ تعلیمات قرآنی اور اسوۂ نبوی ﷺ سے ہم پر یہ واضح ہوتا ہے کہ اس امانت کی ذمہ داری کو ایک مسلمان کس طرح بطریقِ احسن پایۂ تکمیل تک پہنچا جاسکتا ہے۔

اقبالؒ نے زندگی کو ایک ناقابل تقسیم وحدت سمجھا ہے جسے مسلسل ارتقا کے عمل سے گزرنا ہے۔ فرماتے ہیں:

یہ عالَم یہ بت خانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں
مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے، تُو جہاں سے نہیں
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

غور کیجئے تو ان افکار میں جو روشنی ہے، وہ سب ارشادات قرآنی کا فیض ہے۔ سورۃ الملک کے آغاز میں ارشاد ہوا ہے:

''نہایت بزرگ و برتر ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ

ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔جس نے موت اور حیات کو ایجاد کیا تا کہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

اسلام کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو انسان کی بالادستی سے نجات دلاتا ہے اور بتاتا ہے کہ انسان کی فلاح کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ کے عطا کردہ ضابطۂ حیات کے مطابق باہمی مشاورت سے معاملات و مسائل طے کرنے کے لئے وہ ایک نظام کی تشکیل کرلیں۔

قائدِاعظمؒ کے نام ایک خط میں علامہ اقبالؒ نے لکھا:

"اسلامی قوانین کے گہرے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس قانون کو اچھی طرح سمجھ کر عمل کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کے لئے حقِ روزی محفوظ ہو جاتا ہے۔لیکن اس ملک میں جب تک آزاد مسلم ریاست وجود میں نہ آئے، اسلامی شریعت کا نفاذ ممکن نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوںؒ کی نشاۃِ ثانیہ میں اقبالؒ کے فکر و فن کی اہمیت اس کی ہمہ گیریت میں ہے اور یہ ہمہ گیر اس بنا پر ہے کہ انہوں نے اسلام کے ضابطۂ حیات کو اپنا مقصدِ حیات بنایا اور اس کی حقانیت کو دورِ حاضر میں مغرب کی علمی اور عملی برتری اور ان کے باطل نظریات کی ظاہری توانائی کے مقابلے میں واضح کرنے کا شرف حاصل کیا۔انہوں نے کہا:

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہُنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائیِ تعمیر میں، رونق میں صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کر ہیں بنکوں کی عمارات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

فیضانِ سماوی سے محرومی انسان کی سب سے بڑی محرومی ہے اور اس محرومی سے تحفظ کا سامان ہمارے سوا کسی کے پاس نہیں۔ہم نے پاکستان اسی صداقت کی شہادت کے لئے بنایا

تھا۔قیام پاکستان میں اقبالؒ کی فکر کی توانائی اوران کی آرزوؤں کی روشنی ہمارے ساتھ تھی۔

انہوں نے کہا تھا:

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد
کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

قیام پاکستان محض ایک خطۂ ارض کی آزادی کا نہیں بلکہ اسلامی ضابطۂ حیات کی سماجی تشکیل کا اعلان تھااور ساری دنیا کے تمام باطل نظاموں کے لئے اصل خطرہ اسی امکان کا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسلامی فکر کی عملی طور پر سماجی تعبیر ہو جائے۔ابلیس نے اپنے مشیروں سے مخاطب ہوکراسی اندیشے کا اظہار کیا ہے(اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' سے اقتباس)

جانتا ہوں میں یہ اُمّت حاملِ قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں مَیں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے یدِ بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے لیکن ہے یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؑ کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبرؑ سے سوبار الحذر
حافظِ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نہ کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتاہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب

پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے

اسی الجھاؤ نے ہمیں صراطِ مستقیم سے دور کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ہماری ذمہ داری تھی کہ ساری دنیا کو صراطِ مستقیم پر لائیں۔ یہ ہماری ذمہ داری تھی اور یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ پہلے خود راہِ راست اختیار کریں اور پھر یہ دیکھتے رہیں کہ ساری دنیا میں انسان کہیں بھی ظلم وستم کا نشانہ نہ بنیں۔ ہم امتِ وسطہ ہیں۔ اپنے مرکز سے تعلق اور پھر عالمِ انسانیت کی نگہبانی بھی ہمارا فرض ہے۔ حریت، اخوت، مساوات اور صداقت، امانت اور دیانت عالمگیر انسانی اقدار ہیں۔ انسانی معاشرے کے مہذب ہونے کے یہی پیمانے ہیں۔ یہ پیمانے عالمِ انسانیت کو ہمارے وسیلہ سے، قرآن حکیم کے وسیلے سے، ہمارے ہادئ حق رسول اکرم ﷺ کے وسیلے سے ملے ہیں۔ ان کی نگہداشت بہرحال ہماری ذمہ داری ہے۔ اُس دور میں اقبالؒ نے ہمیں اپنی اسی ذمہ داری کا احساس یوں دلایا:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کراے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

مسلمان کی حیثیت سے اس دنیا میں آنا بڑی سعادت ہے، لیکن اتنی ہی بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اقبالؒ کا تصورِ مومن ایک مطمئن انسان کا تصور ہے ایک ایسا انسان جو طمانیتِ قلب سے کہہ

سکے کہ میں نے اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت عالمِ انسانیت کی کوئی خدمت کی ہے اور اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ دل کی یہ دولت مسلمان کی زندگی کا حاصل ہے ۔

من کی دولت ہاتھ آتی تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

اقبالؒ ہمیں اس لئے عزیز ہیں کہ انہوں نے ان باتوں سے ہمارے دل کی بیداری کا سامان مہیا کیا ہے ۔ ہمیں بتایا ہے کہ دل کی آزادی کتنی بڑی نعمت ہے :

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامانِ موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

اقبالؒ کی فکر کا نچوڑ یہ ہے کہ مردِ مومن وہی ہے جس کا دل آزاد ہوتا ہے، بیدار رہتا ہے اور وہ اس منزلِ بلند پر پہنچ جاتا ہے جہاں مسلمان کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگاہ دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز

*****

یہ ہے نظریہ پاکستان

مطیع اللہ محمود

...•••...

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا الہ الا اللہ!

یہ ہے نظریہ پاکستان جس کی بناء اور بنیاد پر 14 اگست 1947ء کو دنیا کے نقشے پر سب سے بڑی اسلامی مملکت اُبھری۔

پاکستان کے مقصود کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلام کی نظر میں لاالٰہ کا مفہوم کیا ہے؟ پاکستان کے استحکام و بقا میں اس کو کیا اہمیت حاصل ہوگی؟ پاکستان کس طرح مضبوط و مستحکم ہوسکتا ہے اور مضبوط و مستحکم پاکستان دنیا میں کیا اہم کردار ادا کرسکتا ہے؟

لاَ الٰہ کا مفہوم

عُرفِ عام میں لَا اِلٰہ سے مراد ہے کہ صرف اللہ ہی لائق عبادت ہے۔ توحید کا یہ تصور سب کو معلوم ہے۔ سب خدا کو ایک مانتے ہیں لیکن توحید اسلامی اور غیر اسلامی عقیدہ میں بڑا فرق ہے۔ غیر مسلموں کو لیجئے، اگرچہ خدا کی یکتائی اور معبودیت کا اُنہیں بھی اقرار ہے لیکن وہ اپنے بتوں، پروہتوں اور کاہنوں کو معبود (لائق عبادت) مان کر شرک کرتے ہیں۔ اللہ کی وحدانیت میں دوئی کا تصور دنیا میں فتنہ وفساد اور بدی کو جنم دیتا ہے۔ پھر غیر مسلموں کی روزمرہ زندگی میں ان کے مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ ان کے نزدیک مذہب انسان کا ذاتی معاملہ ہے جو انسان کی معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی سے بالکل غیر متعلق ہے۔

اس کے برعکس توحید کا اسلامی تصور یہ ہے کہ ساری کائنات کا خالق و مالک اللہ ہے۔ وہ

وحدہ لاشریک ہے۔ وہی سب کا رازق اور معبود و مسجود ہے۔ تمام انسان عالمی برادری کے افراد ہیں۔ ہر فرد قابلِ عزت و تکریم ہے۔ کوئی بڑا ہے، نہ کوئی چھوٹا۔ نام و نسب اور رنگ و نسل کی بناء پر عقیدۂ توحید انسانوں میں ہر قسم کی تمیز و تفریق کو مٹاتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

مٹا دیا میرے ساقی نے عالمِ مَن و تُو
پلا کے مجھ کو مئے لَا اِلٰہ اِلا ھُو

غرض توحید کا اسلامی تصور وہ محور ہے جس کے گرد مسلمانوں کی انفرادی زندگی مثلاً تزکیۂ نفس اور حُسنِ اخلاق نیز اجتماعی زندگی کے تمام پہلو، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کے گرد گھومتے ہیں یا اسے ایسی قوت کہہ لیجئے جو توحید پرست یعنی مسلمان کی انفرادی زندگی کو ایسے سانچے میں ڈھالتی ہے کہ جب مُسلمان مِلّت کی صورت میں اجتماعی زندگی اختیار کرتے ہیں تو عالمی سطح پر تمام مسلمانوں میں ہم آہنگی اور یک جہتی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کا یہ اتحاد و اتفاق عالمی انسانی برادری کے قیام اور عالمی امن کی خوشحالی کے لئے ایک مثال بن جاتی ہے۔ یہی اسلامی تعلیمات کا مقصود ہے۔

پاکستان کے مطالبہ و قیام کی سب سے بڑی غرض توحید کے اسلامی تصور کا تحفظ اور مسلمانوں کو اس کے عملی پہلوؤں سے روشناس کرانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ متحدہ ہندوستان میں اسلام ۔۔۔ جو دین ہے ۔۔۔ دنیا کے دیگر مذاہب کی طرح محض ایک مذہب بنتا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس دستورِ حیات کی تعلیمات سمٹ کر چند عبادات اور غیر اسلامی رسومات تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ قرآنی احکام اور پیغمبرِ اسلام ﷺ کا اُسوۂ حسنہ علمِ کلام کے مسائل بن چکے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں کی عملی زندگی میں عقیدۂ توحید کی کارفرمائی روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا احساس مُفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے مسلمانانِ ہند کو ان اشعار میں دلایا:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اِک مسئلہ علمِ کلام

روشن اِس ضَو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
آہ! اِس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہہ!
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

متحدہ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس ملک میں بحیثیت مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں اور اپنے دین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اُنھیں الگ وطن چاہئے تو ہندو راہنماؤں نے یہ موقف اختیار کیا کہ قومیت کا تصور ملک و وطن پر موقوف ہوتا ہے۔ کسی قوم کے تشخص کی بنیاد جغرافیائی حدود ہیں جس کے اندر وہ قوم سکونت پذیر ہو۔ اس لیے ''ہندوستان کے مختلف مذاہب بشمول اسلام کے پیروکار، ایک قوم ہیں۔''

ہندوؤں کی یہ دلیل دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے دین کے بنیادی پتھر یعنی عقیدۂ توحید کو کھلی للکار تھی جس کا جواب قائدِ اعظمؒ کے زیرِ قیادت مسلمانوں نے متحد ہو کر یہ دیا کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ قومیں ہیں۔ چنانچہ ہندو قوم کے اجزائے ترکیبی ذات پات کی تمیز، انسانی اونچ نیچ اور جغرافیائی حدود ہیں۔ جبکہ مسلمان قوم یا ملت کی بنیاد انسانی اخوت و مساوات اور حریت پر ہے جو بقول مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ عقیدۂ توحید کی عملی صورت ہے۔ اسلام انسانیت پرور اصولوں کا داعی ہے جبکہ ہندو مذہب انسانوں میں تفریق پیدا کر کے انسان دشمنی کا علمبردار ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کفر و شرک کے آلودہ ماحول میں مسلمان انسانی اخوت و مساوات کی بناء پر زندگی بسر کر سکیں اور اپنے آپ کو اور اپنی آئندہ نسلوں کو سچے مسلمان بلکہ صحیح انسان بنا سکیں۔

عقیدۂ توحید اور تعمیرِ شخصیت

اسلام انسان کے اندر وہ صفات پیدا کرنا چاہتا ہے جو اسے صحیح بلکہ کامل انسان بنا سکیں۔ عقیدۂ توحید اس مقصد کے حصول کے لئے ایک قوت کا کام دیتا ہے مسلمان بننے کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کی وحدانیت پر ایمان لایا جائے، ایمان بھی ایسا جس میں ذرہ برابر شک شبہ نہ

ہو۔اسی لئے تو مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کا مسلمانوں کو مشورہ ہے کہ:

باطل دُوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

پھر اس ایمان میں استقامت اور پختگی کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ مضبوط عقیدہ کی بدولت انسان کے ارادہ میں بڑی قوت پیدا ہوجاتی ہے جسے یقین کہہ لیجئے۔جب انسان یقینِ محکم پالیتا ہے تو زندگی کی کٹھن منزل تک پہنچنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ کلمۂ توحید اشہداَن اللہ اِلااِلہ اللہ وَاشہدانَ محمدُرسول اللہ پڑھ کر جب مسلمان اللہ کی معبودیت کا اقرار کرتا ہے تو پنجگانہ نماز باجماعت ادا کر کے اسے اپنی عبدیت اور اللہ کی معبودیت کا عملی ثبوت دینا پڑتا ہے۔نماز کو ہر روز بہ پابندی ادا کرنے سے وہ عمل پیہم کا عادی ہوجاتا ہے۔اس طرح کسی مہم کو سر کرنے کے لئے وہ لگاتار محنت سے جی نہیں چراتا۔مشکل سے مشکل کام کو سر انجام دینے کے لئے مسلسل مشقت اس کی زندگی کا شعار بن جاتی ہے۔اس کے ساتھ ہی اللہ کی خوشنودی اور رضا جوئی کو وہ اپنی زندگی کا مقصود سمجھتا ہے۔اللہ اس کا محبوب و مطلوب بن جاتا ہے۔اللہ کی محبت کا جذبہ اس کے دل میں ایسے گھر کرلیتا ہے کہ اس کا اظہار اللہ کے بندوں سے پیار کی صورت میں ہونے لگتا ہے۔اس طرح توحید کی برکت سے یقینِ محکم، عمل پیہم اور محبت اس کی شخصیت کے مظہر بن جاتے ہیں جو ہر آزمائش کے وقت اس کا ساتھ دیتے ہیں، بقول علامہ اقبالؒ:

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

عقیدۂ توحید مسلمان کو نہ صرف خدا شناس بلکہ خود شناس اور خودنگر بھی بناتا ہے جس کے ذریعے انسان کے دل میں خوداعتمادی پیدا ہوتی ہے اور اس کی فطری صلاحیتیں خوب جلا پاتی ہیں:

خودی کا سِر نہاں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

غرض جب کوئی انسان اللہ تعالیٰ کو ایک مان کر پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے پیشِ نظر زندگی بسر کرتا ہے تو اس کے ذہنی رجحانات ایک مخصوص سانچے میں ڈھلتے جاتے ہیں۔

انجام کار مختلف جذبات کے باوجود جب اس کی ذہنی زندگی عقیدۂ توحید کے زیرِ اثر وحدت کی صورت اختیار کر لیتی ہے تو سچے مسلمان میں ایک ایسی آزاد و خود مختار شخصیت جنم لیتی ہے جس کے خدوخال مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ نے مندرجہ ذیل اشعار میں خوب بیان کیے ہیں:

ہاتھ ہے اللہ کا، بندۂ مومن کا ہاتھ!
غالب و کار آفریں، کار کُشا، کار ساز
خاکی و نوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی، اُس کا دلِ بے نیاز!
اس کی اُمیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب، اُس کی ادا دل نواز
نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو!
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاک باز
نقطۂ پرکارِ حق، مردِ خدا کا یقیں!
اور یہ عالم تمام ، وہم و طلسم و مجاز
عقل کی منزل ہے وہ، عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں ، گرمیٔ محفل ہے وہ!

عقیدۂ توحید اور تعمیر ملت

عقیدۂ توحید جہاں مسلمانوں کی انفرادی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالتا ہے، وہاں ان کی اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چنانچہ مختلف رنگوں، نسلوں اور ملکوں کے لوگ عقیدۂ توحید کی بناء پر ملت کے نام سے ایک وفاق میں شامل ہوتے ہیں اور یہ وفاق ان کی وحدتِ فکر و عمل کا آئینہ ہوتا ہے۔ ان سب کا وطن جغرافیائی حدود کی بجائے ''اسلام'' ہوتا ہے۔ ان کی قومیت ایک ''مسلمان'' ہوتی ہے۔ پھر مسلمانوں کا اتحاد انسانی اُخوت و مساوات اور حریت کے زرّیں اصول پر قائم و دائم ہے۔ کیونکہ اسلامی معاشرہ میں قرآنی حکم کے مطابق ہر فرد کو عزت و تکریم حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں ہمسری کے اصول کے تحت یک جہتی اور ہم آہنگی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ملت کے تمام افراد ہر معاملہ میں عقیدۂ توحید کے زیرِ اثر یک زبان، یک دل اور یک جان نظر آتے ہیں اور ان کی معاشرتی بلکہ معاشی زندگی بھی ایک خوشحال کنبے کے افراد کا بہترین نمونہ ہوتی ہے جس میں ہر فرد جتنا ہو سکے کنبے کی فلاح و بہبود میں حصہ لیتا ہے۔ تعمیرِ ملت میں عقیدۂ توحید کی کارفرمائی ستاروں کے جھرمٹ میں چاند کی مثل ہے۔

پاکستان۔۔۔ایک نصب العین

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل و تعمیر میں عقیدۂ توحید نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور پھر مُفکّرِ پاکستان کے نزدیک ''حقیقی جمعیت کا انحصار اس امر پر ہے کہ نصبُ العینِ ملیہ کو مضبوطی سے تھاما جائے اور اُمتِ محمدیہ کا نصبُ العین حفظ و نشرِ توحید ہے۔'' اس لئے پاکستان کا نصبُ العین بھی حفظ و نشرِ توحید ٹھہرا۔ اس نصب العین کے حصول کا واحد طریقہ قرآنی ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کے پیشِ نظر پاکستان میں انسانی سیرت و کردار کا مکمل اسلامی نمونہ تعمیر کیا جائے تا کہ ایسے افراد پر مشتمل اس سرزمین میں ایسا جمہوری معاشرتی نظام قائم ہو جس کی مثال

حضور رسالت مآب ﷺ کے مبارک عہد میں دنیا کو ملتی ہے۔ یا یوں سمجھ لیا جائے کہ پاکستانی معاشرہ نام ونسب، رنگ وخون اور علاقائی اور صوبائی عصبیت کی آلائشوں سے پاک ہو اور توحید کے اس اسلامی عقیدہ پر مبنی ہو کہ اللہ ایک ہے، وہی سب کا معبود ہے، ساری کائنات اسی نے بنائی ہے، حکومت وفرمانروائی کا حق اختیار صرف اللہ ہی کو حاصل ہے، زمین اور آسمان کی ہر شے کا مالک وہی خدائے یکتا اور لاشریک ہے۔ وہ ربّ العالمین ہے۔ مرنے کے بعد قیامت کے دن ہر انسان کو اس کے سامنے اپنے دنیوی اعمال کا جواب دہ ہونا ہے۔ مخلوقِ خدا اسی ایک اللہ کی ہے، لہٰذا سب انسان بلالحاظ مذہب وملت برابر ہیں اور قدرتی ذرائع میں مساویانہ طور پر حق دار اور شریک ہیں۔ کوئی فرد اعلیٰ ہے نہ کوئی ادنیٰ۔ البتہ متقی اور پرہیز گار لوگوں کو ضرور فضیلت حاصل ہے۔ مگر کسی انسان کو دوسرے انسانوں پر حکومت کرنے یا دھونس جمانے کا کوئی حق حاصل ہے، نہ کوئی اختیار۔ سوائے اس حق واختیار کے جو ملتِ اسلامیہ شریعتِ محمدیہ کی رُو سے کسی شخص یا جماعت کو دے۔ بقول علامہ اقبالؒ:

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتاں کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آزری

غرض پاکستان کتاب وسنت کی روشنی میں پاکیزہ معاشرتی زندگی کا داعی ہے جس کا ہر فرد آزاد وخود مختار ہو۔ ہر شخص کو اس کا صحیح مقام اور جائز حق ملے۔ حاکم ومحکوم اور آقا وغلام کا کوئی تصور نہ ہو۔ کوئی شخص دوسرے شخص پر دھونس نہ جما سکے اور نہ کوئی کسی کا استحصال کر پائے جیسا کہ مُفکرِ پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کا قول ہے:

"زندگی کا کوئی طرزِ عمل یا رویہ جو فرد کے آزادانہ ارتقاء عروج کے راستے میں حائل ہو، وہ شریعتِ اسلامیہ اور اخلاقیاتِ اسلام کے قطعاً خلاف ہے۔ ہر مسلمان اپنے افعال واعمال کے لحاظ سے مختار وآزاد ہے بشرطیکہ خلاف قانونِ وحی اس سے کوئی فعل یا عمل سرزد نہ ہو۔"

توحید کے تصور میں جہاں انسانی آزادی ومساوات کا پہلو مضمر ہے، وہاں مسلمانوں کو

باہمی اتحادواتفاق کاسبق بھی ملتا ہے ۔ بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ عقیدۂ توحید ایک ہمہ گیر وفاق کی بنیاد ہے جومسلمانوں کی وحدتِ فکروعمل اوران کے اتحادکاآئینہ دار ہے ۔مفکرِ پاکستان علامہ اقبالؒ کا یہ قول اس بات کی وضاحت کے لئے کافی ہے :

"اسلام کی حقیقت ہمارے لئے یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اس سے بڑھ چڑھ کر ہے ۔اسلام میں قومیت کامفہوم خصوصیات کےساتھ چھپا ہوا ہے ۔ہماری زندگی کاتصوراس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آسکتا جب تک ہم اصول اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں ۔ باالفاظ دیگراسلامی تصور ہماراوہ ابدی گھریاوطن ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں ۔جو نسبت انگلستان کوانگریزوں اورجرمنی کوجرمنوں سے ہے، وہ اسلام کوہم مسلمانوں سے ہے ۔ جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں "خدا کی رسی" ہمارے ہاتھ سے چھٹی اورہماراشیرازہ بکھرا ۔"

اسی بناء پر بقول مفکرِ پاکستانؒ "قومیت کااسلامی تصوردوسری اقوام کےتصور سے بالکل مختلف ہے ۔ہماری قومیت کااصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن، نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں جورسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہر کائنات کےمتعلق ہم سب کےمعتقدات کاسرچشمہ ایک ہے ۔جو تاریخی روایات ہم سب کوترکہ میں پہنچی ہیں، وہ بھی سب کے لئے یکساں ہیں ۔اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہےاوراس کی قومیت کی جسمانی شکل وہ جماعتِ اشخاص ہےجس میں بڑھتےاورپھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاًموجود ہے ۔اسلام زمان ومکان کی قیود سےآزاد ہے ۔"

پاکستان اورعلاقائی عصبیت

اسلام کی نظر میں صرف اللہ تعالیٰ کو"ایک"،تسلیم کرلینے سے بات نہیں بنتی ۔دنیامیں بمشکل ایک آدھ ایسی قوم ہوگی جس کےتمام افراداللہ کی وحدانیت کےمنکر ہوں گے ۔تقریباًسب قومیں خداکوایک مانتی ہیں ۔امریکی قوم نےتواپنے کرنسی نوٹوں پر لکھ رکھا ہے ۔"خداپر ہمارا بھروسہ

ہے" (IN GOD WE TRUST) قرآن کریم نے کئی مقامات پر ان مفاد پرست لوگوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ کو تو ایک مانتے تھے، لیکن اسلامی طرز زندگی کو محض اس لئے قبول نہیں کرتے تھے کہ اس صورت میں کمزور اور بے بس لوگوں پر ان کا رعب اور دبدبہ ختم ہو جاتا تھا۔ فی الواقع توحید پرست بننے کے لئے توحید کا زبان سے اقرار کرنے کے علاوہ توحید کے مضمرات کو عملی زندگی میں اختیار کرنا ضروری ہے، یہی تصدیق بالقلب ہے۔

بقول مُفکرِ پاکستانؒ توحید کے تین عملی پہلو ہیں:

(1) آزادی (2) مساوات (3) اتحاد۔ ملتِ اسلامیہ تمام افراد کا آزادی اور مساوات کی بناء پر ایک وفاق ہے۔ اگر کسی علاقہ یا صوبہ کے چند مفاد پرست اور خود غرض مسلمان توحید پر ایمان تو رکھتے ہوں، لیکن اپنے علاقہ میں اپنی بادشاہی قائم رکھنے کی غرض سے اپنے علاقہ کے سادہ دل غریب عوام میں نسلی یا علاقائی عصبیت کو ہوا دیں، تو ان کا یہ فعل اسلام کے سراسر منافی ہوگا اور وہ نظریہ پاکستان کے مخالف کہلائیں گے۔ کیونکہ پاکستان کے قیام کا مقصد پنجابیوں، سندھیوں، بلوچیوں اور افغانوں کے آزادانہ میل جول سے ایک نئی جامع کمالات پاکستانی بلکہ مسلم ملت پیدا کرنا ہے اور یہی توحید کا منشاء ومنتہا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ اسلامی اخوت (ملت) واحد برادری ہے لیکن مفاد پرست لوگوں نے اس اخوت ووحدت کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور الگ گروہ بنا لیے ہیں اور ہر گروہ اپنی جتھے بندی پر کتنا خوش ہوتا ہے (23-25) پھر ایک اور مقام پر قرآن حکیم فرعون کی ایسی فرقہ بندی کی مذمت کرتا ہے۔ پاکستان میں بھی جو مفاد پرست چار یا پانچ قومی نعرہ لگائیں، ان کا طرز عمل یقیناً شرک کرنے کے مساوی ہوگا۔

صوبائی عصبیت کی آگ ان مٹھی بھر مفاد پرست لوگوں نے سلگا رکھی ہے جن کا اسلامی نظام زندگی میں کوئی ٹھکانہ نہیں اور پاکستان ان کے ارادوں کے لئے عظیم خطرہ ہے۔ پھر انہیں اسلام یا پاکستان عزیز ہو تو کیونکر؟ بات یہ ہے کہ متعدد قومیتوں کا نعرہ لگانے والے لوگ زندگی

کے ہر میدان میں نا اہل ہیں ۔اگر ان کی سرداری، جاگیر داری اور زمینداری ان سے چھن جائے جس کا انہیں اسلامی قانون کے نفاذ کے پیش نظر ہر وقت خطرہ رہتا ہے تو بازار زندگی میں کوڑیوں کے داموں بکیں اور کوئی ان کا خریدار نہ ہو۔ جب تک نا کردہ کار لوگوں کا یہ طبقہ پاکستان میں موجود ہے، صوبائی عصبیت یا قومیتوں کے نت نئے شوشے کھڑے ہوتے رہیں گے اور یہ عنصر مرکزی حکومت کے لئے دردسر بنتا رہے گا۔ پاکستان کی سالمیت کیا بلکہ اسلام کے بنیادی عقیدہ کے تحفظ کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے عناصر پر نگاہ رکھی جائے ۔

قائداعظمؒ کا مسلمانوں کو یہی مشورہ ہے :

''پاکستان مسلمانوں کی وحدتِ ملی کا آئینہ دار ہے اور اسے ایسا ہی رہنا چاہیے ۔ سچے مسلمانوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ جان ومال سے اس کی پاسبانی اور حفاظت کریں ۔''

پاکستان کا وجود عقیدۂ توحید کا مرہونِ منت ہے ۔ پاکستان اسلامی دستورِ حیات کی ایک لیبارٹری ہے جس کی غرض اسلامی سیرت وکردار کے بہترین نمونے تیار کرنا ہے ۔اس سے مقصود انسانی اخوت ومساوات اور معاشی انصاف کی بناء پر ایک مثالی جمہوری معاشرہ کا قیام ہے تا کہ یہ مملکت ایک طرف اسلامی نظام زندگی کا ناقابلِ تسخیر قلعہ بن جائے اور دوسری طرف روشنی کا مینار بن کر دنیا میں اسلام کی از سرِ نو سربلندی کی تحریک کا آغاز کرے ۔دولت کے اسلامی نظریہ کے پیش نظر ایک عالمی کنبہ بن کر بھوک جہالت اور بیماری دور کرنے کے لئے متحد ومتفق ہو۔

*****

قیام پاکستان: ہمارے ایمان کا تقاضا

پروفیسر حسنین کاظمی

...•••...

پاکستان کا قیام مسلمانوں کی تاریخ کا ایک منفرد تجربہ ہے۔قیام پاکستان کے لئے برِصغیر کے مسلمانوں نے مشترکہ اور متحدہ طور پر جد وجہد کی اور اس طرح انہوں نے اپنا ایک دینی فرض ادا کیا۔پاکستان کے قیام کے اثرات عالمگیر سطح پر بھی مرتب ہوئے اور عالمِ اسلام پر بھی اس طرح ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کے احیاء کے امکانات روشن تر ہوئے اور اسی امکان نے پاکستان کے مملکتی وجود کو ان عالمی قوتوں کے لئے خصوصاً برطانوی سیاستدانوں کے لئے ایک بڑے سوالیہ نشان کی صورت دے دی جو پہلی جنگِ عظیم 1914-18 میں فتح مند ہونے کے بعد مسلمانوں کی مرکزیت یعنی سلطنتِ عثمانیہ کو منتشر کرنے کے بعد مطمئن ہو گئی تھیں کہ اپنے اصل حریف کو وہ بالکل بے دست و پا کر چکی ہیں۔پاکستان کا قیام برِصغیر کے مسلمانوں کی آزادی کی علامت ہی نہیں تھا بلکہ اپنی نظریاتی حیثیت کی وجہ سے پاکستان ان عالمی قوتوں کے لئے تشویش کا باعث بنا جو مسلمانوں کو عالمگیر سطح پر پوری طرح بااختیار اور آزاد دیکھنے پر آمادہ نہیں تھیں اور اب بھی نہیں ہیں۔

نظریاتی حوالے سے پاکستان کے قیام کی جد وجہد نہ صرف درست تھی بلکہ برِصغیر کے مسلمانوں کے فکری، علمی اور تہذیبی شعور کا یہ ناگزیر تقاضا تھا کہ ان کو قرآن وسنت کی روشنی میں ایک اہم سماجی تجربے کے لئے سازگار فضا میّسر آئے۔دو قومی نظریے کا اعلان کسی تعصب کا اظہار نہیں تھا بلکہ اس شعور کی بیداری کا نتیجہ تھا جو توحید پر ایمان کے معاشرتی مضمرات کے ادراک سے پیدا ہوتا ہے۔یہی شعور ہے جسے مولانا حالی نے بہت سادہ لیکن بے حد پُراثر انداز

میں بیان کیا ہے کہ

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا

قرآنِ پاک کے وسیلے سے اللہ تعالیٰ نے پہلی مرتبہ انسانی شعور کے لئے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ اصولی طور پر سارے انسان ایک برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''ایہا الناس'' (اے لوگو!) کے الفاظ پہلی مرتبہ ہمارے ہادیٔ برحق رسول ﷺ نے ادا فرمائے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں حضور پاک ﷺ نے جو کچھ فرمایا، ساری دنیا کے انسانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے گروہِ نسلِ انسانی، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سیاہ کو سرخ پر اور سرخ کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے.....''

ہمارے رسولِ اکرم ﷺ کا انسانیت کے لئے یہ پیغام تعلیماتِ قرآنی کا تسلسل ہے، وضاحت ہے اور تشریح ہے۔ قرآنِ پاک کی سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا ہے :

''لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے''(آیت نمبر 13)

سورۃ الروم کی آیت نمبر 22 میں ارشاد ہُوا ہے :

''اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف۔ یقیناً اس میں دانش مند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں''

اب اس قدر واضح اور صاف انداز سے غیر مبہم اعلان کے بعد وحدتِ نسلِ انسانی کا تصور تو

اسلام کی بنیادی تعلیمات میں شامل ہو جاتا ہے لیکن کائنات کی ہر شے اور ہر نوع کی تخلیق یکسانیت رکھنے کے باوجود تنوع اور نیرنگی کی حامل بھی ہوتی ہے ۔اللہ کی ہر تخلیق میں اس کی صفتِ توحید بھی کارفرما رہتی ہے جس کا ادراک اہلِ علم اور صاحبانِ نظر کر سکتے ہیں ۔نسلِ انسانی کی بھی یہی کیفیت ہے ۔نسلِ آدم کی یکسانیت کی بنیاد یہ ہے کہ وہ سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے اور اس میں تنوع اور نیرنگی اور رنگوں، نسلوں، قوموں، برادریوں اور خاندانوں کا فرق اس لئے ہے کہ ہر انسان کی معاشرتی زندگی کا تقاضا اور اس کے شخصی اعمال اور افکار کے نتائج کی بنیاد ہے ۔اس لئے افرادِ نسلِ انسانی کے مابین تکریم اور عزت و احترام کا معیار اس کا رنگ یا اس کی زبان یا اس کی خاندانی، نسلی یا زمینی شناخت نہیں بلکہ اس کے افکار اور اس کے اعمال ہیں ۔اور یہ فیصلہ انسان نے نہیں کیا، حیات و کائنات کے خالق نے کیا ہے کیونکہ پوری نسلِ انسانی کے بارے میں اس قدر بنیادی اور اساسی وحدت کے فیصلے کوئی انسان کر ہی نہیں سکتا ۔ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے ذاتی مفادات اور تعصّبات سے بلند ہو کر اس فیصلے کو تسلیم کر لے ۔ہمارے ہادیٔ برحق رسول ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کے لئے اپنے آخری اور مکمل پیغام میں دیگر حتمی فیصلوں کے ساتھ وحدتِ نسلِ انسانی کا یہ فیصلہ بھی انسانوں تک پہنچایا اور اللہ کے آخری پیغمبر ﷺ نے اس فیصلہ کو معاشرتی زندگی میں قابلِ عمل بنا کر اس کی صداقت کی تصدیق کی اور نسلِ انسانی اس فیصلے کی قبولیت کی بلندیوں کی جانب آہستہ آہستہ بڑھتی چلی جا رہی ہے ۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد جمعیت اقوام یعنی لیگ آف نیشنز بنی تو وہ بھی اس ہدایت کی قبولیت کی جانب اہلِ مغرب کی جانب سے پہلا قدم تھا ۔علامہ اقبالؒ نے ضربِ کلیم میں اپنی نظم بہ عنوان ''مکّہ اور جنیوا'' میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہُوئی عام
پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدتِ آدم
تفریقِ ملل حکمتِ افرنگ کا مقصود

اسلام کا مقصود فقط ملّتِ آدم
مکّے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟

تعلیماتِ اسلامی کی بنیادی صفت یہ ہے کہ وہ انسانی رجحانات کی نفی نہیں کرتیں بلکہ ان رجحانات کی توانائی کو تعمیری سمت عطا کرتی ہے۔اسلام خاندان، قبیلہ، قومیت یا قوم، ان جیسے الفاظ یا ان جیسے دوسرے الفاظ کی جو انسانی تاریخ میں اصطلاحات کی صورت اختیار کر گئے ہیں، کلیتاً نفی نہیں کرتا بلکہ ان کی وضاحت اور تشریح کرتا ہے۔قوم نسبتاً ایک بڑا گروہ، قومیت نسبتاً ایک چھوٹا گروہ یعنی کسی خصوصیت یا امتیاز کی بنا پر یکجا ہو جانے والے لوگ۔مثلاً:

- ☆ مذہب کی بنیاد پر جمع ہوں تو مسلمان، ہندو، عیسائی
- ☆ وطن کے حوالے سے جمع ہوں تو پاکستانی، بھارتی
- ☆ صوبائی بنیادوں پر پہچان کی جائے تو سندھی، بلوچی، پنجابی، پٹھان وغیرہ
- ☆ بادشاہوں کے حوالے سے بات کی جائے تو قوم فرعون، قوم نمرود وغیرہ
- ☆ نبیوںؑ کے حوالے سے پہچان کرائی جائے تو قوم موسیٰؑ اور قوم نوحؑ وغیرہ
- ☆ نسل کی بنیاد پر لوگ یکجا ہوں تو چنگیزی، تیموری وغیرہ
- ☆ برِاعظموں کی بنا پر شناخت ہو تو یورپین، ایشیائی، افریقی وغیرہ
- ☆ زبان کی بنیاد پر جمع ہوں تو عربی، یونانی، عبرانی وغیرہ
- ☆ صفات کی بنیاد پر پہچانا جائے تو نیکوں کی قوم، کافروں کی قوم، فاسقوں کی قوم وغیرہ

ہمارا دین ان تمام نسبتوں کی نفی نہیں کرتا بلکہ ان کو انسانوں کے مابین باہمی شناخت اور پہچان کا ذریعہ سمجھتا ہے۔یہ فرق قدرت کے نظام کا حصہ ہے۔اسلام اس کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس نیرنگی کے نتیجے میں جو تخریبی انداز کی عصبیت انسان میں بیدار ہوتی ہے، اس عصبیت کو اسلام انسانی معاشرے کے لئے نقصان دہ قرار دے کر اس سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے۔

بقول علامہ اقبالؒ

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصّب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے جو جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

تعصّب کی یہ دیوار وحدتِ نسلِ انسانی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ بلاشبہ انسان کی بہ حیثیت فرد کوئی نہ کوئی شناخت تو ہوتی ہے۔ رنگ کی، خاندان کی، قبیلے کی، ملک کی، لیکن اس پہچان کو تعارف اور شناخت کی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ اس تعارف کو تعصب میں تبدیل نہیں ہونا چاہیے۔

انسانوں میں جتنے بھی ظاہری فرق ہیں مثلاً زبانوں کا، آوازوں کا، رنگ کا اور نسل کا وہ فرق انسان کی جسمانی سطح کی نمائندگی کرتے ہیں جسے دوسرے لفظوں میں حیوانی سطح کی زندگی کا فرق بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن انسانوں کے مابین انسانی سطح پر تفریق کی صرف ایک بنیاد ہے، وہ ہے ایمان کی بنیاد۔ اہلِ ایمان ایک گروہ یا قوم یا ملت یا اُمت اور وہ جو اہلِ ایمان نہیں ہیں، وہ سب کے سب دوسرا گروہ یا ملت یا اُمت۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تُو مصطفوی ہے

مسلمان کے لئے اس کی دینی شناخت اس کے دوسرے تمام تعارفی حوالوں سے زیادہ اہم ہے اور اس کی ایمانی، فکری اور نظری بنیاد ہے۔ بہ حیثیت مسلمان ہماری امتیازی صفت کا فیصلہ خود قرآن کے ارشادات کے تحت ہوا ہے۔

سورۃ آلِ عمران کی آیت نمبر 110 میں ارشاد ہوا ہے:

''اب تم دنیا میں وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو''

اور اسی حقیقت کو سورۃ البقرہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک اُمتِ وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں

(کے اعمال) پر گواہ بنو اور رسول اللہ تمہارے (اعمال کے) گواہ بنیں۔"

ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جسمانی وطن زمین ہے یا زمینی رشتہ ہے اور ہمارا انسانی وطن ہمارا دین ہے جو ہمیں انسانی سطح کی زندگی کے لئے ہدایت فراہم کرتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبے "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" میں اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

"اسلام کی حقیقت ہمارے لئے صرف یہی نہیں کہ وہ ایک مذہب ہے بلکہ اسلام ہمارے لئے اس سے بڑھ کر ہے۔ اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور اپنی قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں۔ بالفاظِ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے جس میں اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو نسبت انگلستان کو انگریزوں اور جرمنی کو جرمنوں سے ہے، ویسی ہی نسبت اسلام کو ہم مسلمانوں سے ہے۔ جہاں بھی اسلامی اصول یا مقدس روایات کے حوالے سے اللہ کی رسی ہمارے ہاتھ سے چھوٹی ہماری جماعت یا ملت کا شیرازہ بکھر گیا"

اسی خطبے میں ایک اور جگہ علامہ اقبالؒ نے کہا ہے:

"مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قوم کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصلی اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن یا مفادات کا اشتراک، بلکہ ہم لوگ اس برادری سے ہیں جو جنابِ رسالت مآب ﷺ نے قائم فرمائی تھی، اس لئے کہ مظاہرِ کائنات سے متعلق ہم سب کے اعتقاد کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات اس حوالے سے ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں۔"

اس بات کی مزید وضاحت انہوں نے اس طرح کی ہے کہ "چونکہ اسلام کا جوہر ذاتی

بغیر کسی آمیزش کے خاص طور پر ذہنی یا تخیلی ہے لہٰذا کیسے ممکن تھا کہ وہ قوم کے تصور کو کسی خارجی یا حسی اصول مثلاً وطن پر مبنی قرار دینا جائز تصور کرے۔''

برصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے اپنے قومی تشخص کے اعلان اور اس بنیاد پر اپنے لئے ایک آزاد اور خودمختار مملکت کے مطالبے کا تاریخی پس منظر صدیوں پر محیط ہے اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ سے لے کر دورِ حاضر کے صاحبانِ فکر ونظر تک ہمارے لئے قابلِ فخر اور قابلِ احترام نظریاتی رہنمائی کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان کے سارے روشن افکار و نظریات کی نہایت مؤثر یکجائی ہمیں علامہ اقبالؒ کے فکروفن میں اور ان کے خطبات میں میسر آجاتی ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو علامہ اقبالؒ کا آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دسمبر 1930ء کا خطبۂ صدارت خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس خطبے میں علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کے قومی تشخص کو دینِ اسلام کے بنیادی تقاضے کی صورت کچھ اس قدر موثر انداز میں پیش کیا تھا کہ وہ برِصغیر کے مسلمانوں کی خودشناسی کے سفر کا نقطہ آغاز بن گیا۔

جہاں تک برصغیر کی تقسیم اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی الگ الگ مملکتوں کے قیام کی تجاویز کا تعلق ہے، تو علامہ اقبالؒ سے بہت پہلے مختلف سیاسی، علمی اور سماجی شخصیات اس نوعیت کی تجاویز پیش کر چکی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تجویز برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے لئے خودمختار مملکت کے مطالبے کا نقطہ آغاز نہیں بن سکی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اس تصور کی ایک فکری اور نظری اساس مہیا کی اور ایک اہم سیاسی جماعت کے سالانہ اجلاس میں اپنے خطبۂ صدارت کی بنیاد بنا کر اسے پیش کیا۔ جہاں تک بات ہے مسلمانوں میں شعور کی بیداری کی تو مولانا الطاف حسین حالیؒ اور علامہ اقبالؒ دونوں اپنی فکروفن کے وسیلے سے ان کے لئے خودشناسی کی زمین پہلے ہی ہموار کر چکے تھے۔ اب ضرورت ایک بڑے نصب العین کے تعین کی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے اس ضرورت کو بھی اپنے الہٰ آباد کے خطبہ صدارت کے ذریعے پورا کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ 1857ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی شکست، حصولِ آزادی کی

راہ پر ان کی جہدِ مسلسل کا مرحلہ آغاز بھی بنی۔ 1857ء سے 1947ء یعنی 90 برس تک ان پر تاجِ برطانیہ کے مہیب سائے میں غلامی کی لعنت مسلط ضرور رہی لیکن اس دور میں ان کو خود شناسی کے حوالے سے نئی زندگی کا پیغام بھی ملا جس نے ان میں خود اعتمادی کی خوابیدہ توانائی کو اس انداز میں بیدار کیا کہ ایک آزاد اور خود مختار مملکت تک ان کے سفر کی راہ میں پھر بڑی سے بڑی مخالف قوت بھی حائل نہ ہو سکی اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس خود اعتمادی اور خود شناسی کی بیداری میں علامہ اقبالؒ کی فکر و فن اور ان کی نظریاتی خطبات کا بے حد اہم اور کلیدی کردار ہے۔

اس حقیقت کی وضاحت کے لئے خطبۂ الٰہ آباد کے چند اہم اقتباسات سامنے لانا ضروری ہیں جن میں ماہ و سال کی طویل گردش اور خود ہمارے ملک میں بہت واضح نظریاتی انتشار کے باوجود، آج بھی سچائی کی توانائی اور کشش موجود ہے۔ اس خطبے میں علامہ اقبالؒ نے کہا:

''اسلام ہی وہ سب سے اہم جزو ترکیبی تھا جس سے برِ صغیر کے مسلمانوں کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام کی بدولت مسلمانوں کے سینے اُن جذبات و انوار سے منّور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا انحصار رہتا ہے۔ جن سے متفرق اور منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک الگ و متعین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان میں ایک خاص اخلاقی شعور بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں صرف ہندوستان ہی وہ واحد علاقہ ہے جہاں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کا اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین اور اداروں کی احسان مند ہے جو اسلامی تہذیب سے وابستہ ہیں۔''

انہوں نے مزید یہ وضاحت کی ہے:

''ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے اور دنیا کی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں ہے تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا وہ تو ایک طبعی امر ہو جاتا ہے۔ اسلام کے نزدیک انسان کی ذات بجائے خود ایک وحدت ہے۔ اسلام مادے اور روح کی کسی ناقابلِ اتحاد ثنویت کا قائل نہیں ہے۔ اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، مادہ اور روح اور عبادت گاہ اور ریاست ایک ہی کل کے اجزاء ہیں۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی ہی ایک

شکل کا نام ہے جس کا اظہار قیودِ زمانی و مکانی میں ہوتا ہے ۔"

ذرا آگے جا کر اسی خطبے میں علامہ نے کہا ہے :

"اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے، جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں ہے ۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں ۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو دوسرے کا ترک بھی لازم آ جائے گا اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے تیار ہو گا جس کا وطنی یا قومی اصول اسلام کے اصولِ اتحاد کی نفی پر مبنی ہے ۔

علامہ اقبالؒ نے یہ بات 1930ء میں کہی تھی ۔ غور کیجئے کہ کیا موجودہ صورت حال کے پیشِ نظر ان افکار پر دوبارہ پوری سنجیدگی سے غور کرنے اور ان سے روشنی حاصل کرنے کی شدید ضرورت نہیں ہے؟

اس خطبے کے دو مزید اقتباسات پیش کرنے ضروری ہیں جن سے پاکستان کے وجود کی غرض و غایت پر روشنی پڑتی ہے ۔ ایک اہم بات جو اقبالؒ نے کہی، یہ ہے :

"برطانوی ہند (1930ء میں) دنیا میں سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اسلام بہ حیثیت ایک تمدنی قوت کے اس ملک (یا اس خطۂ ارض) میں زندہ رہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے ایک علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے ۔"

گویا قیامِ پاکستان کا اصل مقصد محض حصولِ اقتدار اور حکومت کا قیام نہیں تھا بلکہ اس ملک کو ایک بلند تر مقصد کے حصول کے لئے قائم ہونا تھا اور وہ مقصد تھا کہ برصغیر میں اسلام ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہے اور اسلامی تمدن کا تحفظ اور اس کی ایک زندہ مثال دورِ حاضر میں اس لئے ضروری ہے کہ یہ اب عالمِ انسانیت کی ضرورت بن گئی ہے ۔ انسان کی فنی، تیکنیکی اور ایجاداتی ترقیاں حقیقی معنوں میں اس وقت قابلِ اعتبار اور قابلِ فخر بن سکتی ہیں جب خود انسان کو اپنی زندگی کے اصل مقاصد کا صحیح ادراک ہو ۔ اس کے پیشِ نظر اپنی سماجی ذمہ داریوں کی تکمیل

کے لئے اس کے پاس ایک **مکمل** لائحہ **عمل** ہو اور مقصدِ حیات انسانی اور اس کی روشنی میں سماجی زندگی کا ایک **مکمل** لائحہ **عمل** عالمِ انسانیت کو اسلام کے سوا کسی دوسرے وسیلے سے نہیں مل سکتا۔"

اقبالؒ نے رُوسو کے معاہدۂ اجتماعی کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ اسلام نے اس معاہدۂ عمرانی کا اظہار بہت پہلے کر دیا تھا اور یہ حقیقت بھی ہے۔

رُوسو نے اٹھارہویں صدی میں ایک اہم سیاسی نظریہ دیا جسے معاہدۂ عمرانی (SOCIAL CONTRACT) کہا جاتا تھا۔ رُوسو کا ایک جملہ دورِ حاضر کی تاریخ میں ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے : "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔" یہ دونوں باتیں سامنے رکھئے اور پھر ارشاداتِ قرآنی سامنے لائیے۔ انسان کے بارے میں سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے کہ

"بلاشبہ ہم نے انسان کو **قابلِ تکریم** پیدا کیا ہے اور اس کو خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں اور پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سے مخلوق پر نمایاں فوقیت دی۔"

اب ان دونوں باتوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔ ایک یہ کہ انسان **قابلِ تکریم** پیدا ہوا ہے اور دوسری یہ کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ **قابلِ تکریم** ہونا آزاد ہونے سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ تکریم میں آزادی کا شامل ہونا ضروری ہے جب کہ آزادی میں تکریم کا شامل ہونا ضروری نہیں۔ انسان کا ذہن صدیوں کے المناک تجربات سے گزرا تو بالآخر وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے لیکن خالق و مالک نے اپنی "احسنِ تقویم" تخلیق کے لئے تکریم کے رُتبے کا تعین اپنی ہدایت کی تکمیل کے ساتھ کر دیا تا کہ علم کے حوالے سے انسان خود اپنی ہی تکریم کے شعور سے بے خبر نہ رہے۔ گویا اصولی طور پر ہر انسان تکریم کا حق لے کر پیدا ہوتا ہے اور اس تکریم کو اپنے افکار و اعمال کے ذریعے تحفظ دینا ہر فرد کی ذمہ داری ہے۔ معاشرتی زندگی میں انسان کی حیثیت کا تعین اس کے اعمال سے، افکار سے اور کردار سے ہوتا ہے جس کے لئے قرآن پاک میں خدا ترسی یا تقویٰ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

سورۃ الحجرات کی آیت نمبر 113 میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

"لوگوں! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور پھر تمہاری قومیں اور برداریاں بنا دیں تا کہ تم ایک دوسرے سے تعارف حاصل کرو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔ یقیناً اللہ جاننے والا اور باخبر ہے"

نظامِ قدرت کے ہر قانون، ہر اصول کی طرح انسان کے لئے تکریم کا تصور بھی بے مثال ہے۔اب دوسرا تصور جو ڈسونے دیا وہ معاہدۂ عمرانی کا ہے۔اس سلسلے میں بھی قرآن پاک کی ایک آیتِ مقدسہ سے بڑی رہنمائی ملتی ہے۔سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 172 میں فرمایا گیا ہے:

"اے نبی لوگوں کو یاد دلائیے وہ وقت جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اس کی نسل کو نکالا تھا اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا کہ بیشک آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ہم اس پر گواہی دیتے ہیں۔یہ ہم نے اس لئے کیا کہ لوگ قیامت کے روز کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے"

یہ آیت مبارک اس عہد کی طرف اشارہ کررہی ہے جو انسان نے اپنے خالق اور مالک کے سامنے کیا۔عہد یہ تھا اور یہی ہے کہ انسان اللہ کے سوا کسی بھی دوسری قوت کو اپنا خالق و معبود نہیں مانے گا اور کسی کے سامنے اپنا سر نہیں جھکائے گا۔یہ عہد نامہ انسان اور معبودِ حقیقی کے مابین ہے لیکن اس کا تعلق براہِ راست انسان کی معاشرتی اور عمرانی زندگی سے ہے۔ایک طرف یہ تصور رکھئے کہ انسان نے خود ہی، حالات اور ضرورتوں کے تحت، باہمی طور پر مل جل کر رہنے کے لئے آپس میں ایک معاہدہ کر لیا اور دوسری طرف یہ حقیقت پیشِ نظر رکھئے کہ عمرانی زندگی کی ابتدا ہی انسان نے اس عہد سے کی کہ وہ اللہ کے سوا کسی بھی دوسری قوت کی برتری اور بالادستی تسلیم نہیں کرے گا اور اپنے معاشرتی معاملات و مسائل اللہ کی ہدایات کی روشنی میں حل کرے گا۔

انسانوں کے مابین معاہدات میں کمزور اور زبردست اور مفاد پرست اور محروم کا فرق ان معاہدات کو بے زور اور یک طرفہ بنا دیتا ہے جبکہ اللہ اور بندے کے درمیان معاہدے میں جذبات، مفادات، خواہشات اور تعصّبات کا دخل نہیں ہوتا کیونکہ یہ کیفیات انسان پر اثر انداز ہوتی ہیں، اللہ کی ذات کیفیات سے بلند ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی معاشرتی زندگی میں توازن پیدا کرنے میں معنویت کی توانائی پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے اللہ کے حضور انسان کا ایک عہد قرار دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود میں سب سے اہم اور سب سے مقدّم قوت محرکہ ایمان ہی کی ہے۔ ایمان انسان کو خود شناس بھی بناتا ہے اور اس میں خود احتسابی کی صلاحیت بھی پیدا کرتا ہے۔ غور کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ انسانی آزادی کا اس کی خود احتسابی کی صفت سے بڑا گہرا تعلق ہے، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انسانی معاشرے میں آزادی کی فضا قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے میں اس خود احتسابی کی صفت کا بنیادی اور اساسی کردار ہوتا ہے۔ دنیا میں جس معاشرے میں افراد میں خود احتسابی کی صفت جتنی بیدار ہوگی، اس معاشرے میں اسی نسبت سے آزادی کی فضا موجو نظر آئے گی۔

حیات و کائنات کے خالق کی حیثیت سے اللہ واحد پر ایمان، توحید پر ایمان کہلاتا ہے اور توحید پر ایمان انسانی زندگی کے ہر خیال، ہر عمل اور ہر فیصلے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ توحید پر ایمان دراصل ہر اعتبار سے بھرپور انداز میں بے حد اہم معاشرتی مضمرات کا حامل ہے۔

توحید پر ایمان کی ترقی کے مضمرات پیشِ نظر رہیں تو علامہ اقبالؒ کے الہ آباد کے خطبے میں کہی گئی اس بات کی گہری معنویت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے کہ ''اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں بلکہ ایسی ریاست ہے جس کا ظہار رُوسو سے بہت پہلے ایک ایسے سماجی وجود میں ہوا جو پوری طرح ایک معاشرتی عہد کا پابند تھا۔'' گویا مسلمان کی ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کا اصل مقصد اسی معاشرتی عہد نامے کی تجدید ٹھہرا۔ یعنی یہ مسئلہ کہ جہاں بھی ممکن ہو سکے مسلمان اسی انداز

کی مملکت کے قیام کے لئے جد وجہد کریں، یہ مسئلہ ہمارے لئے پسند یا ناپسند کا یا اختیاری نہیں ہے بلکہ یہ ہم پر اللہ کی جانب سے ایک فرض کے طور پر عائد ہوتا ہے اور اس فرض کی تکمیل ہماری انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ دوقومی نظریئے کی یہی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر دوقومی نظریئے کا اعلان ناگزیر تھا۔

قائداعظمؒ نے سب سے اہم اور سب سے زیادہ بنیادی بات کہی تھی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی ایک آزاد مملکت کا قیام خود اسلام پر ہمارے ایمان کا ایک بنیادی مطالبہ تھا۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا اور اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے کیونکہ فکرونظر کے کسی بھی انداز کے مقابلے میں اسلام کبھی ثانوی یا ذیلی حیثیت اختیار کر ہی نہیں کرسکتا۔ اپنے نظریۂ حیات کے مطابق آزاد فضا میں ایک نظام عدلِ اجتماعی کے بغیر ہمارے ایمان کے تقاضے پورے ہی نہیں ہوتے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ برصغیر میں ایک آزاد خطۂ ارض کے قیام کا امکان ہمیں نظر آجاتا اور پھر بھی مصلحتاً ہم اس سے کمتر کسی منزل کے حصول پر مطمئن ہو جاتے؟

اسلام کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک زندہ، متحرک اور توانا نظریۂ زندگی ہے۔ اسلام ہماری سماجی زندگی کے لئے قوانینِ قدرت کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو امن وفلاح کے ساتھ شخصی حریت کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے اور پھر اسلام صرف ایک نظریہ ہی نہیں، ایک حقیقت بھی ہے۔ گزشتہ چودہ سو برس میں انسان کی تہذیبی، فکری اور علمی تاریخ کو اسلام نے سب سے زیادہ فعال اور مثبت انداز میں متاثر کیا ہے اور ایک جوئے رواں کی طرح قرآنی افکار اور سیرتِ طیبہ کی روشنی آج بھی ساری انسانیت کے تمام تعمیری اور مثبت رجحانات کی آبیاری کررہی ہے۔

اس مرحلے پر ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری ہے۔ غلط فہمی یہ کہ ہم عموماً اسلام کی تاریخ کو اور مسلمانوں کی تاریخ کو یکساں قرار دیتے ہیں اور یہ بات درست نہیں۔ ایک خاص دور تک، خصوصاً رسالت اور خلافت کے دور کے تسلسل میں تو اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ساتھ ساتھ چلتی ہے بلکہ وہ دور اسلامی تعلیمات کے سماجی اطلاق کی بہترین مثال ہے لیکن اس کے بعد اسلام اور

مسلمانوں کی تاریخ میں فرق آ گیا ہے ۔گزشتہ چودہ سو برس میں انسانی اقدار نے جتنا بھی فروغ پایا ہے، قانون کو انسانی معاشرے میں جتنی بالا دستی حاصل ہوئی ہے، انسان کو جتنا بھی احترام اور آزادی میسر آئی ہے اور انسانیت کی فلاح، اتحاد اور باہمی رواداری کی راہیں جتنی بھی کشادہ ہوئی ہیں، ان کی تاریخ ہی اسلام کی اصل اور حقیقی تاریخ ہے ۔انتشار، ضعف اور زوال مسلمانوں کی تاریخ میں آیا ہے، اسلام کی تاریخ میں نہیں آیا ۔

اگر غور کیجئے تو اندازہ ہو جائے گا کہ پاکستان کا قیام برصغیر کے مسلمانوں کی اس آرزو کا ثمر تھا کہ وہ اپنی سماجی زندگی کو اسلامی تعلیمات اور سیرتِ نبوی ﷺ سے ہم آہنگ کرنے کا عہد کر رہے تھے ۔ پاکستان اللہ کی جانب سے ہمارے اسی عہد کا انعام ہے ۔حصولِ پاکستان کی جد وجہد بے مثال ہے ۔اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو متحدہ برصغیر میں بھی مسلمان اپنے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حقوق کچھ نہ کچھ تو ضرور حاصل کر لیتے لیکن اسلامی نظام کے قیام کے تجربے کا کوئی امکان نمایاں نہ ہوتا ۔ہمارا اصل مقصد یہ تھا کہ قیامِ پاکستان کے وسیلے سے اپنے لئے ایک باعزت اور بامقصد زندگی گزارنے کی راہیں ہموار کریں، اقتصادی، فنی، تیکنیکی اور دیگر ذیلی ترقیاں تو اس اعلیٰ مقصد کی راہ میں خود بخود منزل بہ منزل حاصل ہوتی چلی جائیں گی ۔

دنیا میں نظری اور علمی اعتبار سے اللہ تعالیٰ کا حقیقی تصور صرف قرآن پاک میں محفوظ ہے، اس کے علاوہ جو تصورات ہیں، وہ نہ مکمل ہیں نہ خالص ۔ان میں خواہشات، جذبات، افکار اور تعصبات کی آمیزش ہو گئی ہے ۔انسان کے لئے اللہ کے حقیقی وجود پر ایمان لانا اور اپنے اعمال اس ایمان کے مطابق بنا لینا اس لئے ضروری ہے کہ اس سے کائنات کی اور انسان کے اپنے وجود کی مقصدیت واضح ہوتی ہے ۔گویا انسان کے لئے منزل بھی سامنے آ جاتی ہے اور منزل تک پہنچنے کا راستہ بھی روشن ہو جاتا ہے ۔

قرآن پاک اور سیرتِ طیبہ کے پیشِ نظر یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ پر ایمان کا مسئلہ انسان کا ذاتی یا انفرادی مسئلہ نہیں، توحید پر ایمان مکمل سماجی مضمرات کا حامل ہے ۔جیسے کسی

شہری کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنی مملکت کے ضابطوں اور قوانین کو تسلیم کرنا اپنا ذاتی مسئلہ قرار دے اسی طرح یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآنی تصور تسلیم کرنے کے بعد اس پر ایمان کو ذاتی یا شخصی مسئلے کی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مملکت کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرنا اگر ذاتی مسئلہ ہے تو اللہ پر ایمان کا اعلان جسے اس پورے نظامِ حیات وکائنات پر مکمل اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے، ہمارے لئے محض شخصی مسئلہ کیسے بن سکتا ہے۔

یہاں یہ بات کہنا بھی ضروری ہے کہ انسان کا اللہ پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا خود اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی موضوعی مسئلہ نہیں۔ اللہ کی ذات ان کیفیات سے بلند ہے۔ انسان کا کوئی عمل اور اس کی کوئی فکر اللہ کی ذات پر کسی صورت اثر انداز نہیں ہوسکتی۔ انسان اگر اللہ پر ایمان لائے تو اللہ سے اس کی قدرت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اگر ایمان نہ لائے تو اللہ کی قوت اور قدرت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ اللہ کی ذات مطلق ہے اور نفی اور اثبات کے اثرات سے بلند ہے۔

اللہ کا ماننے یا نہ ماننے کا تعلق افکار و اعمال سے ہے اور انسانی اعمال و افکار ہی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ جس طرح دنیا میں انسان کے لئے سماجی زندگی بسر کرنا ضروری ہے اور اس کے لئے سماجی قانون بنانا اور ان کو ماننا ضروری ہے، اسی طرح دنیا میں آکر حیات وکائنات کے خالق کے وجود کو تسلیم کرنا یعنی ان کی ہدایت کو اپنی زندگی میں رہنما بنانا ضروری ہے۔ اللہ کے قوانین احترامِ آدمیت کی ضمانت فراہم کرتے ہیں:

☆ اللہ نے بنی آدم کو قابلِ تکریم قرار دیا ہے لہٰذا اللہ کے قوانین احترامِ آدمیت کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

☆ اللہ نے انسان کو ''احسنِ تقویم'' قرار دیا ہے لہٰذا اللہ کے قوانین انسان کے لئے ایسی راہیں ہموار کرتے ہیں جن پر چل کر وہ انسانیت کی امکانی بلندیوں تک پہنچنے کی کوشش کر سکے۔

☆ اللہ نے انسان کی خامیوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے یعنی انسان نادان، جذباتی، تنگدل اور جلد باز ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ کے قوانین انسان کو انسان ہی کے ظلم اور جذبات کی

ناانصافیوں سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ یہ ہیں اللہ پر ایمان کے چند اہم سماجی مضمرات۔

برِصغیر کے مسلمانوں کے قومی وطن کی حیثیت سے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کے قیام کو علامہ اقبالؒ نے محض ایک خطۂ زمین پر حکومت کے جھنڈے پھیلانے کے لئے پیش نہیں کیا تھا۔ ان کے پیشِ نظر اصل مقصد بہت زیادہ بلند تھا اور یہ مقصد بھی خود علامہ کے ذہن کا گھڑا ہوا نہیں تھا بلکہ ارشاداتِ قرآنی اور سیرتِ پاک کے گہرے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ اس مملکت کے قیام کا مقصد انہوں نے خود اسی خطبہ الہ آباد میں یوں بیان کیا ہے:

''میں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے اعتبار سے ایک منظم اسلامی ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازنِ قوت کی بدولت امن قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہو سکے گی بلکہ وہ زمانۂ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔''

حرفِ آخر

یہ تھا اصل مقصد پاکستان کے قیام کا، پاکستان کے قیام کے مطالبے کی بنیاد کے طور پر برصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے یہ اعلان ضروری تھا کہ ان کا تشخص اور ان کی اجتماعی پہچان وطنی قومیت نہیں بلکہ دینی رشتہ ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے تردید اس بات کی کی تھی کہ برصغیر میں صرف ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم آباد نہیں بلکہ یہ کثیر القومی علاقہ ہے اور اس میں دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو قوم ہے اور دوسرے مسلمان ہیں جو ہر اعتبار اور ہر انداز میں اپنا جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور اس لئے وہ ایک الگ اور جدا قوم ہیں۔ یہ بنیاد تھی اس تصور کے اظہار اور اعلان کی جسے دو قومی نظریہ کہا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ دو قومی نظریئے کا اعلان بجائے خود کوئی مقصد نہیں تھا بلکہ ایک بڑے مقصد یعنی

پاکستان کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا اور پاکستان کا حصول بھی بجائے خود کوئی مقصد نہیں تھا، بلکہ اس مملکت کو دورِ حاضر میں اطلاقِ اسلام کے لئے ایک تجربہ گاہ کی حیثیت حاصل ہونی تھی۔ گویا دو قومی نظریئے کا اعلان قیامِ پاکستان کی جانب پہلا قدم اور قیامِ پاکستان کا اصل مقصد اس مملکت میں دورِ حاضر کے تقاضے پیشِ نظر رکھتے ہوئے اور قرآنِ پاک اور سیرتِ طیبہ سے اکتسابِ نور کرتے ہوئے ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی تنظیم و تشکیل تھا۔

*****

معمار پاکستان کی آواز

ڈاکٹر سید اسعد گیلانی

...•••...

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے بانی ہیں۔ان کو یہ اعزاز اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔خطۂ پاکستان کو جغرافیائی حیثیت سے وجود میں لانے کا سہرا تاریخ نے ان ہی کے سر باندھا ہے۔

مُسلم لیگ نے 23 مارچ 1940ء کو جب مسلم ہندوستان کے علیحدہ وجود کے تصور کو اپنے لاہور سیشن میں ایک قرارداد کی صورت میں اپنا نصب العین بنایا اُس وقت تک ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اسلامی مملکت قائم کرنے کے تصور کو پیش کئے ہوئے علامہ اقبالؒ کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ آزاد مملکت کا مطالبہ اٹھانے کی تجویز برابر اور مسلسل پیش کرتے رہے تھے۔ بعض دوسرے لوگ بھی اس طرز پر مختلف تجاویز پیش کر چکے تھے اور پاکستان کے سیاسی تصور کو فکری میدان میں کافی تعارف حاصل ہو چکا تھا۔یہ چرچا مسلمانوں میں عام تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کا واحد حل اب علیحدہ اسلامی مملکت کے سوا دوسرا اور کوئی نہیں ہے لیکن پاکستان کا تصور پیش کرنے میں علامہ اقبالؒ کے بعد پھر کسی کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔اُن ہی کی بات تھی جسے بعد میں مختلف لوگ اپنے ہی دل کی آواز سمجھ کر دہراتے رہے ہیں۔

قائدِ اعظمؒ ایک صاحب نامور مدبر اور صاحب فہم سیاستدان تھے۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک مُخلص اور عملی سیاستدان تھے۔ بہت بڑے بیرسٹر ہونے کے باوجود وہ ڈرائنگ روموں کی آرام کرسی والی سیاست کے قطعاً قائل نہ تھے بلکہ ان کے ہاں آرام و راحت

اور محض جوڑ توڑ کی سیاست کا سرے سے کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ وہ انگریز کی ذہانت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ پارلیمانی سیاست کی رگ رگ سے آگاہ تھے۔ ہندو کی مکاریوں اور چالبازیوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ قوم کے مخلص اور حقیقی بہی خواہ اور وفادار رہنما تھے۔ اُن کو اپنی قوم پر اعتماد تھا اور اِسی اعتماد کی قوت سے انہوں نے قوم میں آزادی کی رُوح پھونک دی تھی۔

قائداعظمؒ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ ان کو نہ خریدا جاسکتا تھا، نہ دھوکا دیا جاسکتا تھا، نہ ڈرایا جاسکتا تھا اور نہ جُھکایا جاسکتا تھا۔ وہ دلیل سے بات کرتے تھے۔ ان کے ٹھنڈے استدلال میں بھی جوش وقوت اور ناقابلِ شکست عزم کی آمیزش ہوتی تھی۔ ان کو مل کر ہر شخص ان کے اخلاص کا قائل ہو جاتا تھا۔ ان سے بات کر کے ہر شخص سمجھ لیتا تھا کہ ہندوستان میں مسلم قوم کے مفاد کے لئے یہ شخص پتھر کی چٹان کی مانند ہے جسے اِدھر سے اُدھر سرکایا نہیں جاسکتا۔ انہیں ایک ہی لگن تھی کہ مسلمان قوم کو انگریز کے بعد نمودار ہونے والے تنگ ظرف اور تنگ ذہن خونخوار برہمی سیاہ سامراج سے بچایا جائے اور مسلمان قوم کے لئے ان کا ایک آزاد وطن حاصل کیا جائے۔ جس میں وہ اپنی تہذیب وقانون اور تصورِ زندگی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال سکے۔ اسی بیش بہا اور عظیم الشان نصب العین کیلئے قائداعظمؒ نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، دوسرے الفاظ میں ہندوستانی مسلمان کے لئے علیحدہ ایک آزاد خطۂ زمین کا حصول اور اس اسلامی مملکت میں اپنی پسماندہ قوم کے لئے اسلام کے حیات بخش تہذیب وتمدن، قانون، تعلیم اور تصورِ زندگی کا اجراء وقیام۔

انہوں نے پہلے اپنے آپ کو اپنی قوم کی اس ضرورت کے لئے تیار کیا۔ ذہنی جسمانی، فکری اور مالی طور پر تیاری کی اور پھر اپنے آپ کو اس مشن کی جنگ میں جھونک دیا۔ یہ جنگ صلیبی جنگوں سے زیادہ خوفناک تھی۔ جس کے کئی محاذ تھے۔ اگر قائدِاعظمؒ جیسے مضبوط اعصاب کا انسان نہ ہوتا تو وہ اس لڑائی میں ہمت ہار جاتا یا گوشہ گیری اختیار کرلیتا، لیکن قائداعظمؒ مسلمانوں کیلئے وقت کی ضرورت تھے اور قدرت نے انہیں اسی کام کے لئے منتخب کیا تھا۔ بلا شبہ اس انتخاب

میں علامہ اقبالؒ کی چشم بصیرت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

قائداعظم کا مقابلہ انگریز کی حکمتِ عملی سے تھا، جس کی تمام تر ہمدردی اوّل روز سے ہندو کی طرف تھی۔ کیونکہ وہ ہندو قوم کو اپنے لئے سودمند اور سازگار سمجھتا تھا جو ہمیشہ بہت زیادہ وفاداری سے انگریز کی اطاعت و خدمت میں مصروف رہی تھی۔ انگریز نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے لی تھی، اس لئے وہ مسلمانوں کو اپنا حریف سمجھتا تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو انگریز کے پورے دور میں مجموعی طور پر انگریز کی مخالفت اور ظالمانہ طرزِ عمل کی چکّی میں مسلسل پِسنا پڑا۔ اس میں 1857 کی تحریکِ آزادی سے لے کر تحریکِ مجاہدین تک کی دشمنیاں شامل تھیں۔ یوں بھی برطانوی سامراج کے پنجۂ استبداد میں دنیا میں سب سے زیادہ مسلم ممالک ہی تھے۔ اسی لئے وہ مسلمانوں کو قابو اور بے بس رکھنے کے لئے ان پر سیاسی اور معاشی جبر کرتا تھا۔ انگریز کے بعد ہندو قوم تھی جو مکاری، چالبازی اور سیاسی و معاشی ظلم و ستم میں انگریز سے بھی آگے تھی۔ مسلمان، حکومت کھو دینے کے بعد اس کے حقیقی روپ کو اچھی طرح دیکھ چکے تھے۔ ہندو ذہنیت مسلمانوں کے علیحدہ وجود کی ہی دشمن تھی اور اس کا طریقِ کار مسلمانوں کو بتدریج اپنے اندر جذب کر لینے اور اسلامی عقائد سے منحرف کر کے کلیتہً ختم کر دینا تھا۔

ایک زمانہ تھا کہ قائد کانگریس میں تھے اور ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ ان کی اتحادی کوششوں کے اعتراف کے طور پر کانگریس کا تعمیر کردہ جناح ہال بھی بمبئی میں موجود تھا۔ قائداعظمؒ نے کانگریس اور ہندو کو بھی بہت قریب سے دیکھا۔ اسی وجہ سے وہ بددل اور مایوس ہو کر سیاست سے الگ ہو گئے۔

اس کے بعد ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ خاموشی سے ملک سے باہر چلے جائیں اور یکسوئی کے ساتھ اپنی قوم کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر کریں۔

لاہور میں بیٹھ کر سارے عالم اسلام پر نظر رکھتے ہوئے غور و فکر کا کام ایک اور ہستی بھی کر رہی تھی ملتِ اسلامیہ کے وہ رمز شناس علامہ اقبالؒ تھے۔ ان کی نگاہ پوری قوم کے افراد پر تھی۔

انہوں نے درہ خیبر سے راس کماری تک دیکھا، کراچی سے آسام تک نظر ڈالی اور انھیں اپنا مطلوبہ ناخدائے ملت لندن میں بیٹھا ہوا نظر آیا جن کے عزائم وارادے اور تدبّر وبصیرت اور اخلاص و جذبے سے وہ خوب اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے اپنے خطوط اور لندن کی ملاقاتوں کے ذریعے اس ناخدائے ملت کو واپس اپنی قوم کی طرف آنے کے لئے آمادہ کرلیا۔

علامہ اقبالؒ نے قائد اعظمؒ کے سامنے جو پروگرام رکھا وہ متحدہ ہندوستان کے اندر مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کے لئے ایک متحدہ آزاد وطن حاصل کرنے اور اس میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا پروگرام تھا۔ علیحدہ وطن کی دلیل یہ تھی کہ ہندوستان کے مسلمان قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے ہندوستان میں ایک علیحدہ قوم تھے اور ان کی قومیت کی بنیاد ان کا دین اسلام تھا۔

قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ انگلستان میں چار سال گزارنے کے بعد 1934ء میں ہندوستان آئے اور مسلم لیگ کی جدید طرز پر تنظیم میں مصروف ہو گئے تھے۔

1935ء میں ہندوستان میں جدید آئین نافذ ہو گیا اور پھر اس آئین کے تحت نئے انتخاب بھی سر پر آ گئے۔ اب اگر ملک بھر میں مسلمانوں کو منظم نہ کیا جاتا تو ان مساعی کے رائیگاں ہو جانے کا خطرہ تھا جو اکابرینِ ملّت سالہا سال سے مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کے لئے سرانجام دے رہے تھے۔ اس لئے قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے ملک بھر کا دورہ شروع کر دیا۔ انھیں اوّل اوّل اگر کچھ کامیابی حاصل ہوئی تو وہ انہی صوبوں تک محدود تھی جن میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اکثریت کے صوبوں کی کیفیت نرالی تھی۔ پنجاب میں سر فضل حسین، آسام میں سر سعد اللہ، سرحد میں سر عبدالقیوم نے اپنی اپنی علاقائی اور مقامی جماعتیں انتخابی مقاصد کے لئے بنائیں، علامہ اقبالؒ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ کے لئے پنجاب میں کام کر رہے تھے اور ان کے دست وبازو تھے۔ قائد اعظمؒ نے مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ بنانے کا کام علامہ اقبالؒ کے سپرد کیا، جو اس زمانے میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ انہوں نے اپنی علالت کے باوجود لبیک کہا۔ 30 مئی 1936ء

کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ طلب کیا گیا جس میں علامہ اقبالؒ صدر اور خان غلام رسول خان بیرسٹر جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔

علامہ اقبالؒ اب کمزوری اور علالت کے باعث تقریباً مستقل طور پر صاحب فراش ہو چکے تھے۔ بینائی روز بروز جواب دے رہی تھی، لیکن وہ دن رات پیش نظر مقاصد کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے نام علامہ اقبالؒ کے جو خطوط بہت مشہور ہیں، اسی زمانے میں لکھے گئے تھے۔ وہ جہاں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لئے شبانہ روز محنت کرتے تھے، وہاں لیگ کو بھی عوامی جماعت بننے کی تلقین کرتے رہتے تھے۔ 28 مئی 1937ء کو انہوں نے قائداعظمؒ کو لکھا:

"لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بھی بنے گی جنہوں نے ابھی تک معقول وجہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کے لئے کوشاں نہ ہو، عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی۔" (لیٹرز ٹو جناحؒ)

انہوں نے قائداعظمؒ کو جتنے خطوط لکھے، ان کا مقصد یہی تھا کہ مسلم قانون شریعت اور ثقافت کی برتری ثابت کی جائے۔ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنایا جائے۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیا جائے۔ مسلم صوبوں اور مسلم ریاستوں کے علیحدہ وفاق کا قیام انتہائی ضروری ہے۔ علامہ اقبالؒ کے قائداعظمؒ پر اعتماد کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے ایک یادگار خط میں لکھا:

"آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی وجہ سے مسلمان قوم اُس طوفان بلا میں صحیح و محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید ملک بھر کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے" (لیٹرز ٹو جناحؒ)

اس خط میں ہندو اور مسلمانوں کی خانہ جنگی، توہین اسلام کے واقعات اور مسلمانوں کی

خوفناک معاشی تنگدستی کا ذکر کرنے کے بعد پھر اس بات پر زور دیا گیا کہ "ایک پُر امن ہندوستان حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ مذہبی عقائد اور جداگانہ قومیت کی بنا پر ہندوستان کو ازسرِ نو تقسیم کر دیا جائے۔"

قائدِ اعظمؒ علامہ اقبالؒ کی اس رہنمائی کے بے حد معترف اور مداح تھے۔ چنانچہ انہی مخطوط (لیٹرز ٹو جناح) کے دیباچے میں قائدِ اعظمؒ لکھتے ہیں:

"جون 1934ء میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کے قیام سے لے کر اکتوبر 1937ء میں لیگ کے اجلاس لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہند کی تاریخ کا ایک پُر از واقعات زمانہ ہے۔ مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کا قیام مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات میں حصّہ لینے کی ایک عظیم کوشش تھی، تو لکھنؤ کا اجلاس مسلم لیگ کو عوامی بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانانِ ہند کا واحد نمائندہ ادارہ بنانے کی طرف پہلا قدم تھا"۔

یہ دونوں مقاصد اسی وقت حاصل ہُوئے جب علامہ اقبالؒ اور انہی جیسے مخلص دوستوں کی مخلصانہ کوششوں اور بے غرض سرگرمیوں کی بدولت نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی۔

مسلمان عوام تو بے خبر تھے کہ مصوّرِ پاکستان علامہ اقبالؒ اس وقت بسترِ علالت پر ہی بڑے بڑے اسلامی ہند کی کس قدر صحیح رہنمائی اور بلند پایہ مفید خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن جاننے والے تو خوب جانتے تھے چنانچہ قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:

"مسلم لیگ کا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت اور اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصّہ لیا۔ اگرچہ ان کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اُس وقت نہیں آ سکا تھا۔"

قائدِ اعظمؒ کی وسیع النظری خود اس بات کا اعتراف ہے کہ علامہ اقبالؒ نے صرف تصور اور نظریۂ پاکستان دینے کی حد تک ہی کام نہیں کیا بلکہ اس تصور کو عملی جامہ پہنانے اور اس نظریۂ کو حاصل اور غالب کرنے کے لئے عملی سیاست میں بھی حصّہ لیا۔ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد

نمائندہ جماعت بنانے کے لئے زبردست جدوجہد کی۔قائدِ اعظمؒ کو مسلمانوں کا واحد اور حقیقی رہنما تسلیم کروانے اور اس مقام قیادت پر کھڑا کرنے میں بڑی خدمات سرانجام دیں۔تاریخ ان کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہ کرے گی کہ انہوں نے ہی منزل دی، انہوں نے ہی منزل کے سنگ ہائے میل دیئے۔کارواں کی نشاندہی کی اور میر کارواں کو متعین کیا اور پھر خود بانگ درا بلند کر کے اعلان کر دیا کہ:

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اس وقت مسلمانوں کا کارواں مسلم لیگ تھی اور جب تک اسے مسلمانوں کا واحد کارواں ثابت نہ کیا جاتا اور اسے انگریز اور ہندو سے بھی منوایا نہ جاتا۔انگریز سے مسلم مفاد کی بات اور ہندو سے مسلم حقوق کے تحفظ کا ذکر قطعاً ممکن نہ تھا۔اس وقت علامہ اقبالؒ کی یہ نشاندہی بالکل صحیح تھی کہ سب سے پہلے کارواں کا تعین ہونا ضروری ہے کہ مسلمانوں کا سیاسی کارواں کون سا ہے۔بے شمار جماعتیں تھیں۔انگریز اور ہندو مسلمانوں کا استحصال کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے ہی کچھ آدمی اپنے دائرے میں لے کر انہیں مسلمانوں کے لیڈروں اور نمائندوں کی حیثیت سے دکھاتے تھے اور ان سے بھانت بھانت کی بولیاں بُلواتے اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو نظرانداز کر کے ہندو نیشنل کانگریس کو ساری ہندوستانی قوم کی واحد نمائندہ جماعت ثابت کرتے اور صرف اسی کو ہندوستانیوں کے جملہ مفادات وحقوق کے بارے میں بات کرنے کا اختیار دیتے تھے۔
اس لئے علامہ اقبالؒ، قائدِ اعظمؒ اور مسلم لیگ کی سب سے پہلی جنگ تو یہی تھی کہ:

☆ مسلمانوں کا متحدہ سیاسی پلیٹ فارم کون سا ہے جس کی بات مسلمانوں کی بات شمار کی جائے۔

☆ مسلمانوں کا نمائندہ لیڈر کون ہے جو مسلمانوں کے حقوق کی بات کرے تو وہ واقعی مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرے۔

یہ طے کئے بغیر فریقین کا تعیّن ممکن نہ تھا اور فریقین کا تعین کیے بغیر کسی مسئلے کا فیصلہ ممکن نہ

تھا۔اسی لئے کانگریس کا سارا زوراس بات پر صرف ہوتا تھا کہ وہ سارے ہندوستان کی قومی جماعت ہے ۔یہی زمانہ تھاجب کانگریس مسلمانوں کورابطۂعوام کے ذریعا پنےاندرسمیٹ رہی تھی اورنیشنلسٹ مسلمان رہنما مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ کانگریس میں ہندو کے خوف سے شمولیت اختیارکرنے سے گریز کرنا ایمان کی کمزوری اورخوداعتمادی کی قلت کانتیجہ ہےاور بہادرمسلمان تو وہ ہے جوخدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتااورآزادی کے لئے جان کی بازی لگادیتا ہے۔ان جذباتی باتوں کے پیچھے سب نتائج وعواقب چھپ جاتے ہیں۔چنانچہ قائداعظمؒ کے میدان میں آنے کے بعد مسلم لیگ کا سب سے پہلا دعویٰ یہی تھا کہ وہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تھی اور جب تک اسے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر کے اس سے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کی بات نہ کی جائے ،مسلمانوں کی ترجمانی کسی دوسرے پلیٹ فارم سے ممکن نہ تھی۔یہ قائدِاعظمؒ کادعویٰ تھا کہ کانگریس ایک ہندو جماعت ہےاوراسے صرف ہندو کی مفاد کی بات کرنا چاہیے۔حقیقت یہ ہے کہ حکمتِ سیاست اورمعقولیت کے لحاظ سےاس وقت قائدِاعظمؒ کا یہ دعویٰ عین حالات کا تقاضا تھااور یہ دعویٰ منوائےبغیر مسلمانوں کے مسائل کاتجویز کردہ کوئی حل بھی مسلمانوں کےجذبات کی ترجمانی نہ کرتا تھا۔اسی ضرورت کا ایک مظہروہ عوامی نعرہ تھا کہ ’’مسلم ہے تومسلم لیگ میں آ‘‘۔اس سےمرادمسلم لیگ میں نہ آنے والے مسلمان کےاسلام کاانکار نہیں تھا بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ مسلمانوں کی طرف سے جب سیاسی ترجمانی کاواحد پلیٹ فارم مسلم لیگ ہےتو پھرحیثیتِ ملّی کا تقاضا یہی ہے کہ سب مسلمانوں کواسی پلیٹ فارم کے گرد جمع ہوجانا چاہیے۔جواس اجتماعیت سےگریز کرتا ہےوہ ملّی لحاظ سےایک غیر معقول طرزِعمل اختیارکرتا ہے۔جب مسلمان یہ روش اختیارکریں کہ وہ زیادہ سےزیادہ تعداد میں مسلم لیگ میں آ جائیں تواس صورت میں کانگریس کوایک ہندواورصرف ہندوؤں کی ترجمان جماعت ثابت کیاجاسکتا ہے۔

اِسی طرح مُسلم لیگ کایہ دعویٰ بھی تھا کہ قائدِاعظمؒ مسلمانوں کی طرف سےواحدترجمان اور

نمائندہ میں اِن کے سوا انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابلے میں مُسلمانوں کا اور کوئی ترجمان اور نمائندہ نہیں ہے۔ یہ بات اگر پُوری ثُوقت سے کہی جاتی تو اسی صورت میں گاندھی اور نہرو صرف ہندو مفاد کے ترجمان ثابت کئے جاسکتے تھے۔ ورنہ بے شمار مسلمان ترجمانوں کی موجودگی میں وہ بھی اپنی ٹوپی میں مسلمانوں کی ترجمانی کے پَر لگاتے تھے۔ نہرو نے کھُلم کھُلا کہا: ''مسلمانوں کی علیحدہ تہذیب کیا ہے؟ بس ایک اُونچا پاجامہ اور ایک ٹُوٹنی دار لوٹا۔'' لیکن جب قائدِ اعظمؒ کو مسلمانوں کا واحد نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا تو اس کی مصلحت یہی تھی کہ اتنے نازک موقع پر مسلمانوں کی ترجمانی کا حق کانگریس اور ہندو لیڈروں سے لے کر مسلمانوں کی طرف منتقل کیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ جب ایک موقع پر کانگریس مسلم لیگ مذاکرات میں ایک طرف سے قائدِ اعظمؒ سامنے آئے اور دوسری طرف سے کانگریس نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کو پیش کیا تو قائدِ اعظمؒ نے مذاکرات سے انکار کر دیا۔ قائدِ اعظمؒ یہ بات گوارا نہ کر سکے کہ کانگریس چالبازی سے مولانا آزادؒ کو بھیج کر مسلمانوں کے حقِ واحد نمائندگی کو مجروح کرے اور مکاری سے کانگریس کو بھی مُسلمانوں کی نمائندہ جماعت اور مسلمانوں کے مفادات کی محافظ پارٹی کے طور پر پیش کرے۔ یہی سبب ہے کہ انہوں نے خالص اسلامی بنیاد پر مولانا آزادؒ سے ملاقات سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ ہندو کانگریس کو ہندوؤں کی نمائندگی کے لئے کسی ہندو رہنما خصوصاً مسٹر گاندھی کو بھیجنا چاہیے۔

اس طرح یہ حکمتِ سیاست جو علامہ اقبالؒ کی وضع کردہ تھی اور جسے قائدِ اعظمؒ نے ذہانت سے استعمال کیا، یہ تھی کہ:

1۔ کانگریس نہیں بلکہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

2۔ ہندو لیڈر یا مسلمان کانگریسی لیڈر نہیں بلکہ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ ہی مسلمانوں کے جذبات و مفادات اور خیالات کے ترجمان ہیں۔

یہ حکمتِ عملی رواں کرنے کے لئے قائدِ اعظمؒ کو کانگریس پر پیہم سیاسی حملے کرنے پڑے جو

مسلم قوم کی نظریاتی جنگ کا حملہ ہے ۔انہوں نے ایک موقع پر فرمایا:

''صرف ایک چیز مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان میں کھویا ہوا وقار بحال کرنے کی قوت پیدا کر سکتی ہے ۔پہلے تو انہیں اپنی روحوں کی دوبارہ تسخیر کر کے اُن عظیم روایات اور اصولوں پر سختی سے جم جانا چاہیے جو اُن کے زبردست اتحاد کی بنیاد ہیں اور جو اُن کو ایک ہی سیاسی جماعت کے رشتے میں منسلک کرتے ہیں ۔اگر مسلمانوں کو فرقہ پرست، رجعت پسند یا ایسے ہی دوسرے القابات سے نوازا جائے تو آپ اس کی پرواہ نہ کریں ۔مسلمانوں میں سے آج کا بدترین ٹوڈی اور فرقہ پرست جب اپنے آپ کو غیر مشروط طور پر کانگریس کے حوالے کر کے اپنی ہی قوم کی توہین کرتا ہے تو وہ تمام قوم پرستوں کا تاجدار بن جاتا ہے ۔اِن اصطلاحوں، گالیوں اور غلط سلط لفظوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا کر کے انہیں دنیا بھر میں بدنام کیا جائے ۔ہم اِس قسم کے پروپیگنڈے سے شدید نفرت کرتے ہیں ۔''

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ، 15 اکتوبر 1937ء)

اس کے بعد کانگریس کی حقیقت کھولتے ہوئے فرمایا:

''کانگریس سَراسَر ایک ہندو جماعت ہے اور مُسلمانوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ کانگریس کو یہ جتادیا ہے کہ آئندہ تقدیر کا دارومدار حکومت اور مُلک کے انتظام، اُن کے سیاسی حقوق کے حصول اور قومی زندگی میں واجب حصّہ حاصل ہونے پر ہے اور اس کے لئے وہ اس وقت تک برسرِ پیکار رہیں گے جب تک ہندو راج کا خواب وخیال کانگریس کے دل ودماغ سے بالکل ختم نہ ہو جائے گا۔''

(اجلاس مسلم لیگ لکھنؤ، کلکتہ، 17 اپریل 1938ء)

پھر 20 فروری 1940ء دہلی مُسلم لیگ کے اجلاس میں قائدِاعظمؒ نے فرمایا:

لوگ مُجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا مقصد ومطالبہ کیا ہے ۔بات بالکل صاف ہے ۔برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے، مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں اور ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے اور نہ مسٹر

گاندھی اور کانگریس کو کرنے دیں گے ۔ہم ان دونوں کے اثر سے آزا دہونا چاہتے ہیں ۔''

یہ گویا مطالبۂ پاکستان کی طرف اشارہ تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لیے کانگریس کی حقیقت بار بار کھولی اور اس کے مکروہ عزائم کا پردہ چاک کیا۔ چنانچہ ایک موقع پر انگریز اور ہندو دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''تمہاری تعداد سب سے زیادہ ہوا کرے، تم ترقی یافتہ اور تمہاری اقتصادی حالت مستحکم ہی سہی، اور تم سمجھا کرو کہ سَروں کی گنتی ہی آخری فیصلہ ہے، لیکن میں تمھیں بتائے دیتا ہُوں کہ تم تنہا یا تم دونوں متحد ہو کر بھی، ہماری رُوح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہوسکو گے ۔تم اس تہذیب کو کبھی مٹا نہ سکو گے، اُس اسلامی تہذیب کو جو ہمیں ورثے میں ملی ہے ۔ہمارا نُور ایمان زندہ ہے، ہمیشہ زندہ رہا ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔ بے شک تم ہمیں مغلوب کرو، ہم پر ظلم وستم کرو، ہمارے ساتھ بدترین سلوک روا رکھو، لیکن ہم ایک نتیجے پر پہنچ چکے ہیں اور ہم نے یہ سنگین فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر مرنا ہی ہے تو لڑتے لڑتے مرجائیں گے ۔''

(مرکزی اسمبلی،22 مارچ 1939ء)

جب جنگِ حقوق وقومیت زوروں پر تھی تو اینگلوعریبک کالج دہلی میں 1939ء میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے اور گاندھی مسلم ہندوستان پر ۔ہم کہتے ہیں کہ ہم دونوں کو مسلمانوں پر حکومت نہ کرنے دیں گے ۔خواہ دونوں متحد ہو کر یا تنہا کوشش کر کے دیکھیں۔ ساری دنیا مان چکی ہے اور حکومتِ برطانیہ بھی یہ تسلیم کر چکی ہے کہ مسلم لیگ ہی مسلم ہندوستان کی جائز اور نمائندہ جماعت ہے لیکن ابھی تک مسٹر گاندھی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں ۔''

پھر فرمایا:

''دوسال ہوئے میں نے شملہ میں کہا تھا کہ ہندوستان کے لئے پارلیمانی جمہوری نظام

حکومت غیر موزوں ہے ۔اس پر کانگریسی اخبارات نے میرے خلاف طعن وتشنیع سے کام لیا اور مجھے بتایا کہ ''تم اسلام کو نقصان پہنچانے کے مجرم ہو کیوں کہ اسلام جمہوریت کی تلقین کرتا ہے ۔'' مگر جہاں تک مجھے اسلام کا علم ہے وہ ایسی جمہوریت کی وکالت نہیں کرتا جو غیر مسلم اکثریت کو مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار دے ۔ہم کوئی ایسا نظام حکومت قبول نہیں کر سکتے جس کی رُو سے ایک غیر مسلم اکثریت محض تعداد کی بنا پر ہم مسلمانوں پر حکومت کرے اور ہمیں اپنا فرمانبردار بنا لے ۔انہوں نے سمجھا ہے کہ مسلمان محض ایک اقلیت ہیں جن پر ہندو اکثریت کو حکومت کرنا چاہیے اور ادھر مسلمان ایک جھوٹے احساسِ سلامتی میں مسلسل مبتلائے فریب رہے اور اقلیت کی اصطلاح کو تاریخی، آئینی اور قانونی سمجھا جانے لگا لیکن مسلمان کسی حیثیت سے بھی یورپی ممالک کی اقلیتوں کی طرح اقلیت نہیں ہیں ۔ایک چیز قطعی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم کسی طرح اقلیت نہیں ہیں بلکہ ہم اپنے نصب العین کے ساتھ بجائے خود ایک علیحدہ اور ممتاز قوم ہیں ۔''

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۔5مارچ 1940ء)

اس طرح قائدِ اعظمؒ نے کانگریس کو مسلمانوں کو مسلسل فریب دینے کے کاروبار سے الگ کر دیا اور اس کا حقیقی روپ دنیا، مسلمان قوم اور خود اس کے سامنے بھی واضح کر دیا ۔ چنانچہ ہندوستان میں پارلیمانی جمہوریت پر تبصرہ کرتے ہُوئے 5فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں فرمایا:

''ہندوستان میں ہماری تربیت برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی روایات کے تحت ہوئی ہے ۔دستور 1935ء جو ہمارے سر پر تھوپا گیا ہے، کم وبیش برطانوی طرز پر مرتب کیا گیا ہے لیکن اس ملک اور انگلستان کی مملکت میں بنیادی تفاوت ہے ۔برطانیہ میں اکثریت کی جماعتیں تغیر پذیر ہوتی رہتی ہیں ۔ان کا رنگ وروپ اور ان کی طاقت اور تعدادِ ارکان آئے دن بدلتی رہتی ہے ۔آج قدامت پرستوں کی حکومت ہے تو کل حُریت پسندوں اور پرسوں مزدوروں کی ۔

لیکن ہندوستان میں یہ حال نہیں ہے۔ یہاں ایک مستقل ہندو اکثریت ہے اور باقی اقلیتیں ہیں جو عرصہ دراز تک اکثریت بن جانے کی توقع نہیں کرسکتیں۔ ہوسکتا ہے کہ اکثریت غیر فرقہ داری کا نقاب اوڑھ لے لیکن وہ اپنی سرشت اور اپنے اعمال و افعال میں بلاشرکتِ غیرے ہندو ہی رہے گی۔ اقلیتوں کے لیے صرف یہی ایک اُمید ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی تنظیم بنائیں اور اپنے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے اختیارات کا ایک معین اور فیصلہ کُن حصہ حاصل کرلیں۔ ایسے اختیار کے بغیر کوئی دستور ہندوستان میں کامیابی سے نہیں چلایا جاسکتا۔''

24 مارچ 1940ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں علامہ اقبالؒ کی عین آرزو کے مطابق ''قراردادِ پاکستان'' منظور ہوچکی تھی اور اب آزاد مسلم ریاست کے علاقے کا تعین ہوگیا تھا۔ مسلمانوں کے ایک علیحدہ قوم ہونے کے دلائل بھی سامنے آتے چلے جارہے تھے اور اب اس مطالبۂ پاکستان میں اخلاقی قُوّت بھی پیدا ہورہی تھی۔ یہ اخلاقی قوت پاکستان کے نظریے کی تھی جس کا تذکرہ اب کثرت سے زبانوں پر آنے لگا تھا۔ چونکہ پاکستان بذاتِ خود کوئی مقصد نہ تھا بلکہ اسلامی نظامِ زندگی کے غلبے کے عظیم مقصد کا ایک ناگزیر ذریعہ تھا، قائداعظمؒ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کراچی کے اجلاس 1943ء میں فرمایا:

''وہ کون سا رشتہ ہے جس سے منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت استوار ہے، وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس اُمّت کی کشتی محفوظ کردی گئی ہے؟ وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر خُدا کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خُدا، ایک کتاب، ایک رسول (ﷺ) ایک اُمّت ۔۔ یہی ہمارا نعرہ ہے۔''

پھر مارچ 1943ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

''پاکستان اُسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہ تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد

کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ ہی نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو وہ پہلی قوم کا فرد نہیں رہا، وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہوگیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبے کا جذبۂ محرک کیا تھا، مسلمانوں کے لئے ایک جُداگانہ مملکت کی وجۂ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی۔اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے اور نہ انگریزوں کی چال، یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ ہے۔''

اس امر سے کسے انکار ہے کہ قائداعظمؒ نے دوقومی نظریے کی بنیاد پر ایک عظیم اخلاقی، سیاسی، آئینی اور قانونی جنگ لڑی۔ان کا مستقل نظریہ صرف اور صرف یہ تھا کہ قومیں علاقوں کی نسبت سے نہیں بلکہ نظریات کی نسبت سے بنتی ہیں اور مسلمان نظریے کے سبب ایک الگ قوم ہیں۔وہ غیر مسلموں کے ساتھ مل کر متحدہ وطنی قومیت بنانے کے اصولاً مخالف تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنی تقاریر اور تحریروں میں پُرزور دلائل دیئے۔قائداعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو ستمبر 1944ء کے خط میں کہا:

''ہم اس کے قائل ہیں اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مسلمان اور ہندو دو بڑی قومیں ہیں جو قوم کی ہر تعریف اور معیار پر پوری اترتی ہیں۔ہم دس کروڑ کی ایک قوم ہیں۔ہم ایک ایسی قوم ہیں جو ایک مخصوص اور ممتاز تہذیب وتمدن، زبان وادب، آرٹ اور فنِ تعمیر، احساسِ اقدار، تناسب، قانونی احکام اور اخلاقی ضوابط، رسم ورواج اور کیلنڈر، تاریخ اور روایات، رجحانات وعزائم کی مالک ہے۔خلاصۂ بحث یہ ہے کہ زندگی اور اس کے متعلقات کے بارے میں ہمارا اپنا ایک امتیازی زاویۂ نگاہ ہے اور بین الاقوامی قانون کی ہر دفعہ کے لحاظ سے ہم ایک قوم ہیں۔''

قائداعظمؒ نے 1943ء میں علی گڑھ یونیورسٹی میں خطاب کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار بھی فرمایا:

''ہمارا دین، ہماری تہذیب، ہمارے اسلامی تصورات وہ اصل طاقت ہیں جو ہمیں آزادی حاصل کرنے کے لیے متحرک کرتے ہیں۔''

پھر اسی زمانے میں اسلامیہ کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے

یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔

"مسلم لیگ ہندوستان کے ان حصوں میں آزاد ریاستوں کے قیام کی علمبردار ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے تاکہ وہ وہاں اسلامی قانون کے مطابق حکومت قائم کر سکیں۔"

بلکہ اگر کسی نے یہ بات کہی کہ پاکستان میں اسلامی شریعت کا قانون نافذ نہ ہوگا تو قائدِ اعظمؒ نے اس کی بھر پور تردید کی:

"انہوں نے اپنے بیانات میں اور اخباری ملاقاتوں میں ایک اور زہر آلود شور برپا کر رکھا ہے کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی شریعت کے بنیادی اصولوں اور قرآنی قوانین سے انحراف کرے گی۔ یہ بات بھی قطعی طور پر غلط ہے۔"

(ڈان 30 جون 1947ء)

پاکستان کے بنیادی نظریے کی تائید قائد اعظمؒ کے ساتھ ساتھ دوسرے اکابرین مسلم لیگ بھی کرتے رہے۔ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم اور قائدِ اعظمؒ کے معتمد ترین ساتھی لیاقت علی خان نے پشاور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں قائدِ اعظمؒ کے اعلانات کا بار بار اعادہ کرتا ہوں کہ پاکستان ایک مکمل اسلامی ریاست ہوگا۔ پاکستان اسلام کی ایک تجربہ گاہ ہوگا۔ اور ہم ساری دنیا کو دکھائیں گے کہ چودہ سو سال پرانے اسلامی اصول اب بھی کارآمد اور دنیا کے رہنما بن سکتے ہیں۔"

(پاکستان ٹائمز۔ 15 جنوری 1948ء)

ایک اور موقع پر قائدِ ملت لیاقت علی خانؒ نے فرمایا:

"پاکستان کا آئندہ دستور قرآن مجید کے احکام پر مبنی ہوگا۔ قائد اعظمؒ اور ان کے رفقا کی یہ دیرینہ خواہش رہی ہے کہ پاکستان کی نشوونما ایک مضبوط اور مثالی اسلامی ریاست کی حیثیت سے ہو جو اپنے باشندوں کو عدل و انصاف کی ضمانت دے سکے۔"

(پاکستان ٹائمز۔ 17 اپریل 1948)

قائد اعظمؒ کا طرزِ عمل تحریک پاکستان کو برپا کرنے کے دن سے لے کر پاکستان کے قیام

تک یکساں رہا۔ وہ جداگانہ قومیت کی بنیاد پر علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ علیحدہ وطن کا اس لیے مطالبہ کرتے رہے تاکہ مسلمان وہاں قرآن وسنت کے احکام کے مطابق زندگی گزار سکیں اور جہاں شریعت کا قانون جاری کیا جا سکے۔

قائداعظمؒ نے تشکیلِ پاکستان کی لڑائی سات سال تک لڑی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ لڑائی انہوں نے تنہا اپنے ٹائپ رائٹر کی مدد سے لڑی۔ ظاہر ہے کہ قوموں کی لڑائی تو قومیں ہی لڑ سکتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے انگریز اور ہندوؤں کی چالبازیوں کے لیے جو سیاسی حکمت عملی مرتب کی وہ تنہا ان کا حصہ تھی اور وہ بلاشبہ کامیاب ثابت ہوئی۔ انہوں نے یہ لڑائی علاقہ اور نظریہ کے تعین کے ساتھ لڑی، چنانچہ اس نظریے کی برکت سے پورے ہندوستان کی مسلمان قوم اس جنگ میں شریک ہو گئی۔ جس جنگ کی کامیابی کے نتیجے میں ہندوستان کے صرف ایک شمال مغربی گوشے میں مسلمانوں کی ریاست وجود میں آئی تھی اور باقی سارے علاقوں میں مسلمانوں نے تنگ ظرف ہندو قوم کے انتقام کا نشانہ بننا تھا۔ سارے مسلمان اس بات کو خوب سمجھتے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے لیے ایک گھر مہیا کرنے کا جہاد برپا کیا۔ یہاں تک کہ دارالاسلام یعنی پاکستان بن گیا۔

*****

آزادی کی پہلی للکار

سید حسن ریاض

...•••...

قائداعظمؒ کے دست راست، آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری نشرو اشاعت ، کراچی یونیورسٹی کے استاد پاکستانیات و صحافت سید حسن ریاض کی معرکۃ الآراء تصنیف" پاکستان ناگزیر تھا" کا ایک باب جو موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے پیامِ خود آگہی پیش خدمت ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف نے یہ کتاب 1950ء میں شائع کی تھی۔ بدقسمتی سے اب نایاب ہے۔

1938ء سے میں نے یہ خدمت اپنے ذمے لی تھی کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام مسلمانوں کو سمجھاؤں، اور مسلم لیگ پر مخالفین جو اعتراضات کریں ان کا جواب دوں۔اسی غرض کے لئے منشور جاری کیا گیا۔میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مسلمانوں کے تصورات اور مقاصد کو معین صورت دے کر منشور میں صاف صاف بیان کروں تا کہ کانگریس کے ان خیالات سے، جو اس وقت ماحول پر چھائے ہوئے تھے، مسلمانوں کے ذہن پاک ہوں۔اس کوشش میں وہ مقام آ گیا کہ مسلمانوں کے نصب العین اور مطالبے کے متعلق آخری اور قطعی بات کہنی ضروری معلوم ہوئی۔مسلم لیگ کا ایک نصب العین تھا جو اکتوبر 37ء ہی میں خوب سوچ سمجھ کر قائم کیا گیا تھا۔مگر صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہونے کے بعد جس طرح آئینی تحفظات بیکار ثابت ہوئے تھے، اس کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ کی آواز کانوں میں گونجنے لگی، اور وہ خطبہ صدارت یاد آنے لگا جو انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں پڑھا تھا۔قائدِ اعظمؒ دہلی میں مقیم تھے۔میں

نے ٹیلی فون پر وقت مقرر کیا اور اس روز شام کو ان سے ملا۔

میں نے قائدِاعظمؒ سے کہا: ''مسلم لیگ اب کس مقصد کے لئے جدوجہد کر رہی ہے، کیا مسلمانوں کے لیے کچھ اور تحفظات لینے ہیں؟''

انہوں نے تعجب سے میری طرف دیکھا اور فرمایا: ''آپ کا کیا مطلب ہے، میں نہیں سمجھا؟''

میں نے کہا: ''گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں ہم نے تحفظات حاصل کئے اور تحفظات ہم کو اس سے پہلے بھی ملے، مگر مسلمانوں کے حقوق اور مفاد کی حفاظت ان کے تحفظات کے ذریعے سے نہ پہلے ہوئی تھی اور نہ اب ہو رہی ہے۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ اگر ہم صرف آئینی تحفظات کے لئے کوشش کر رہے ہیں تو یہ بے فائدہ ہے۔

قائدِاعظمؒ نے فرمایا: ''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟

میں نے کہا: ''اپنے حقوق و مفاد کی حفاظت کی طاقت۔''

''تحفظات طاقت ہیں۔'' قائدِاعظمؒ نے زور دے کر کہا۔

اس پر میں بولا: ''مگر اس طاقت کے استعمال اور نفاذ کا اختیار گورنروں اور وائسرائے کو ہے، اور انہوں نے یہ اختیار استعمال نہیں کیا۔''

قائدِاعظمؒ نے بڑی دلچسپی سے پوچھا: ''پھر آپ کے نزدیک چارۂ کار کیا ہے؟''

''اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلم اکثریت کے علاقے کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہوں۔''

میں نے برجستہ جواب دیا۔

قائدِاعظمؒ نے فکر انگیز لہجے میں فرمایا: ''اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کیوں کر ہوگی؟''

میں نے کہا: ''ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو خود مختار دولتوں (ریاستوں) کے درمیان معاہدات سے یا توازنِ قوت سے۔''

قائدِاعظمؒ نے فرمایا: ''آپ نے سندھ مسلم کانفرنس کا ریزولیشن پڑھا''

''جی ہاں پڑھا'' اور میں نے مزید یہ کہا ''مگر سندھ مسلم کانفرنس مسلمانوں کے نصب العین معین نہیں کرسکتی اور اس کا اعلان بھی نہیں کرسکتی۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا کام ہے۔اس کو چاہیے کہ نئے حالات کے لحاظ سے کوئی نصب العین معین کرے یا آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے قوم کی رہنمائی کے لئے کوئی ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔''

قائد اعظمؒ مسکرا کر بولے: ''میں سندھ مسلم کانفرنس میں شریک تھا۔''

میں نے کہا: ''جی آپ تھے،لیکن یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ ریزولیوشن محض اس لئے پاس کیا گیا ہو کہ دیکھیں ہندوؤں پر کیا اثر ہوتا ہے۔''

میری زبان سے یہ نکلا ہی تھا کہ قائد اعظمؒ تیور بدل کر بولے: ''ہم دکھاوے کیلئے ریزولیوشن رد یا پاس نہیں کرتے''۔

میں نے عرض کیا: ''تو پھر آپ فرمائیں کہ کیا وہ ریزولیوشن آپ کے ایما سے پیش اور منظور ہوا؟''

''جی ہاں سنا تھا'' میں نے اقرار کیا اور پھر کہا'' مگر سندھ کی کانفرنس ایک صوبے کی کانفرنس تھی اور میرٹھ کی کانفرنس ایک ڈویژن کی۔ پورے ہندوستان کے مسئلے میں ان کے ریزولیوشن اور تقریریں سند نہیں ہوسکتیں۔آپ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مجھے بتائیے کہ آپ کی کیا رائے ہے۔''

قائد اعظمؒ جوش سے بولتے ہوئے کہنے لگے'' دس برس ہوئے میں طے کر چکا ہوں کہ یہی کرنا ہے۔ ہندوؤں نے ایک جگہ رہنا ناممکن کردیا ہے۔''۔

یہ 1938ء کا واقعہ ہے۔

میں نے اس گفتگو کے بعد انہی لائنوں پر لکھنا شروع کردیا۔قائد اعظمؒ نے بڑی تدریج سے لوگوں کی رائے اور خیال کا رخ نصب العین کی طرف پھیرا،لیکن 1940ء کے آغاز میں انہوں نے ایک ساتھ اس پر زور دے دیا۔ انگلستان کے مشہور اخبار'' ٹائم اینڈ ٹائڈ'' میں انہوں

نے صاف اعلان کیا:

''ہندوستان کے حالات سے برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان تک اس قدر ناواقف ہیں کہ ماضی کے تمام تجربات کے باوجود انہوں نے اب تک یہ نہیں سمجھا کہ یہ طرز حکومت ہندوستان کے لئے قطعی غیر موزوں ہے۔ وہ جمہوری طرز حکومت جو ایسی ہم عناصر قوم کے تصور پر مبنی ہو، جیسے انگلستان کے لوگ ہیں، ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے بالکل مناسب نہیں ہو سکتا جن کی آبادی مختلف قوموں پر مشتمل ہو، اور یہی سادہ واقعہ ہندوستان کی تمام آئینی بیماریوں کی جڑ ہے۔ جمہوریت کا تمام تصور اس مفروضے پر مبنی ہے کہ وہ ایک قوم ہے خواہ اقتصاری اعتبار سے اس میں کتنی ہی تقسیم کیوں نہ ہو، برطانویوں کو یہ حقیقت سمجھنی چاہیے کہ ہندو دھرم اور اسلام دو مختلف اور الگ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور ایک سے دوسرا اپنی اصل روایات اور طرز زندگی میں اس قدر مختلف ہے جتنی کہ یورپ کی مختلف قومیں ہیں اور اس حقیقت کو جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی آن انڈین کانسٹی ٹیوشنل ریفارمز تک نے تسلیم کیا ہے۔ جس کی رائے اس معاملے میں بڑی ٹھوس ہے، اس لئے مسلمان قوم کے پاس یہ سوال کرنے کی وجہ موجود ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں مغربی طرز جمہوریت کیوں زبردستی نافذ کیا اور پھر اس طرح کہ اس کو ہندوستان کے حالات کے موافق کرنے کے لئے اس نے اس پر کوئی حدود و قیود بھی عائد نہیں کیں ..... اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان میں ایک بڑی اور ایک چھوٹی قوم ہے، تو جو پارلیمنٹری طرز حکومت اکثریت کے اصول پر مبنی ہوگا، لازماً اس کے معنی کثیر التعداد قوم کی حکومت ہوں گے۔ اس لئے مغربی جمہوریت ہندوستان کے لئے بالکل غیر موزوں ہے اور ہندوستان پر اس کا مسلط کرنا ہندوستان کے سیاسی جسم میں مرض اور بیماری پیدا کرنا ہے''

اس موقع پر میں قائدِ اعظمؒ نے دو باتوں کا صاف صاف اعلان کیا:

☆ ایک اس بات کا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں۔

☆ دوسرا اس کا کہ ہندوستان میں مغربی جمہوری طرز حکومت نہیں ہونا چاہیے۔ وہ

ہندوستان کے حالات کے لئے موزوں نہیں ہے۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے یکم جنوری کو مسٹر گاندھی کے خط کے جواب میں انہیں لکھا:

"مجھے اس معاملے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے اور مجھے پھر کہنے دیجئے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے اور نہ ایک ملک ہے۔ یہ برصغیر ہے جس میں بہت سی قومیں ہیں، ہندو اور مسلمان ان میں دو بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ کو اس سے انکار ہے کہ قوم کے تعین میں مذہب سب سے بڑا عنصر ہو سکتا ہے لیکن خود آپ ہی کے قول کے مطابق جب آپ ایک سیاسی وفد کے ساتھ مسٹر مانٹیگو کے پاس گئے اور انہوں نے آپ سے یہ سوال کیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصد کیا ہے، تو آپ نے ان کو یہ جواب دیا تھا: "وہی چیز جو وہ کرنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے، جو ہم کرتے ہیں۔" پھر جب انہوں نے یہ سوال کیا کہ آیا وہ مذہبی ہے، معاشرتی ہے یا سیاسی ہے تو آپ نے کہا تھا: "خالص مذہبی۔" اس پر مسٹر مانٹیگو چونک کر بولے "آپ جو ایک معاشرتی مصلح ہیں، اس طوفان سیاست میں کدھر سے آنکلے!" اس پر آپ کا یہ جواب تھا کہ "یہ میری معاشرتی سرگرمیوں ہی میں ایک توسیع ہے۔ میں اس وقت تک مذہبی زندگی نہیں جی سکتا جب تک کہ میں تمام بنی نوعِ انسان کے ساتھ شریک نہ ہو جاؤں اور یہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک میں سیاست میں حصہ نہ لوں آج انسان کی تمام سرگرمیاں ایسی ملی جلی اور پیوستہ ہیں کہ وہ تقسیم نہیں ہو سکتیں۔ معاشرتی، معاشی سیاسی اور خالص مذہبی کو آپ الگ الگ خانوں میں نہیں بانٹ سکتے۔ میں کسی ایسے مذہب سے واقف نہیں ہوں جو انسانی سرگرمیوں سے الگ ہو۔ وہ تمام دوسری سرگرمیوں کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کر دیتا ہے۔ اگر اس میں ان کا وجود نہ ہو تو ساری زندگی خالی شور و شغف میں ایسی بھول بھلیاں بن کر رہ جائے گی جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔"

مسٹر گاندھی کے یہ اقوال نقل کرنے کے بعد قائد اعظمؒ نے مسٹر گاندھی کو لکھا: "فضول بحثوں میں الجھنے سے اور ہریجن اخبار میں سمجھ سے بالاتر فلسفہ، اخلاقیات یا کھدر اور چرخہ کاتنے پر آپ کے عجیب و غریب عقائد کی اشاعت سے ہندوستان کو آزادی نہیں ملے گی۔ صرف عمل اور

تدبیر و رائے سے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ ہمیں آگے بڑھنے میں مدد ملے''۔

قائد اعظمؒ کے اس خط میں خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے براہِ راست مسٹر گاندھی کو لکھا کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے اور نہ ایک ملک ہے۔اس میں بہت سی قومیں ہیں جن میں ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں، بالآخر یہ بھی کہہ دیا کہ یہ قومیں ہیں، مذہب ہی کی بنا پر۔

کانگریس کی تمام کوششیں اس کے لئے تھیں کہ ہندوستان کے مستقبل کے فیصلے میں سوائے ہندو اکثریت کے کسی کی رائے نہ لی جائے اور کسی کی آواز نہ سنی جائے۔یہاں تک کہ اس نے رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں یہ اعلان کر دیا کہ ہندو مسلم مسئلے کا فیصلہ صرف آئین ساز اسمبلی کرے گی۔دوسری طرف قائد اعظمؒ اپنی کوشش اور تدبیر سے حکومتِ برطانیہ کو اس مقام تک لے آئے کہ اس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ انجمن تسلیم کیا، یہ اعلان کیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ اور اس کی سکیم اور پلان کی نظرِ ثانی کی جائے گی، مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر حال اور مستقبل کے متعلق ہندوستان کے لئے نہ کوئی آئین اور قانون وضع اور نافذ کیا جائے گا اور نہ اس سلسلے میں کوئی اعلان ہوگا۔اس طرح حکومتِ برطانیہ نے حقیقت کے مطابق اور واقعے کے مطابق ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کو اہم اور لازمی فریق مان لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی مرتبہ خطرہ اس وقت سامنے آیا تھا جب ملک پر مرہٹوں کا غلبہ ہوا تھا۔اسی وقت سے یہ نصب العین مسلمانانِ ہند کے پیشِ نظر رہا کہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور خود مختار رہو۔ 18 ستمبر 1939ء کو ورکنگ کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ نے یہی بات اور زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی:

''آزاد ہندوستان میں آزاد اور خود مختار خطہ جس میں اپنے مذہبی، سیاسی، ثقافتی، معاشرتی اور اقتصادی حقوق و مفاد کی کامل حفاظت کے اطمینان کے ساتھ اکثریتی فرقہ کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی زندگی کی سرگرمیوں میں مساویانہ شرکت کریں''۔

کانگریس نے مسلم مسئلے کا تصفیہ آئین ساز اسمبلی پر منحصر کر کے گفت و شنید کا دروازہ بند کر

دیا لہذا یہ توقع کی جاتی رہی کہ ہندوستان کی مختلف اقوام اور خصوصاً ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے وہ مستقبل پیدا ہو گا جس میں متحدہ ہندوستان آزاد اور اس متحدہ ہندوستان میں اسلام آزاد اور خود مختار رہو۔ تمام ہندوستان میں مسلمان آباد ہیں اور ہندوستان کی زمین کے ایک ایک انچ پر اس کا وہی حق ہے جو ہندوؤں کا ہے۔ اس میں ان کو اپنی جان، مال اور تمام حقوق و مفاد کی پوری حفاظت کی ضمانت کے ساتھ امور ملکی چلانے میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ برابر کا شریک ہونا چاہیے تھا، تاکہ یہ حفاظت اور ضمانت خود انہی کی طاقت پر مبنی ہوتی۔

بالآخر وقت آ گیا کہ مسلمانانِ ہند اس عظیم نصب العین کا صاف صاف اعلان کریں اور اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کریں، جو مسلم لیگ ہی کے پلیٹ فارم سے علامہ اقبالؒ نے 1930ء میں پیش کیا تھا اور مسلسل غور وفکر کے بعد اب ہندوستانی مسلمانوں کے دل کی تمنا اور قومی مقصد بن گیا تھا۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ آلہ آباد (1930ء) میں علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

"یورپین جمہوریت کا یہ اصول بغیر اس کے ہندوستان پر منطبق نہیں ہو سکتا کہ (ہندو اور مسلمان) مذہبی گروہوں کے وجود کی حقیقت تسلیم کی جائے۔ اس لئے مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر مسلم ہندوستان پیدا کیا جائے، بالکل حق بجانب ہے۔ میرے خیال میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کا رزولیوشن بالکل اسی ایک یکساں جمعیتِ کاملہ کے بلند تصور سے پیدا ہوا، جو اجزائے ترکیبی کی انفرادیت فنا کئے بغیر موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ اپنی ایسی صلاحیتیں روبہ عمل لائیں جو اُن میں چھپی ہوئی ہیں اور معطل ہیں اور مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اجلاس پُرزور طریقے پر ان مسلم مطالبات کی تصدیق کرے گا جو اس ریزولیوشن میں درج ہیں۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمالی ومغربی صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو باہم ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری یا سلطنت برطانیہ سے الگ

شمال اور مغرب میں ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ حکومت کی تشکیل مجھے کم از کم شمال ومغرب کے ہندوستانی مسلمانوں کا قطعی مستقبل نظر آتا ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی مگر اس نے اس بنیاد پر اس کو مسترد کر دیا کہ اگر یہ نافذ کی گئی تو اس سے اتنی بڑی ریاست وجود میں آئے گی کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہوگا"

سرسید کے زمانے میں انگریز اپنا تسلط قائم کر رہے تھے۔ اس وقت کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ کبھی اس ملک کی حکمرانی سے دست بردار ہوں گے۔ اس لئے سرسید نے مسلمانوں کو جداگانہ قومیت کی حقیقت کا ذکر مقابلے کے امتحانوں، مجالسِ قانون ساز اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں ان کے حقوق کے جداگانہ تعین اور تحفظ کے سلسلے میں کیا۔ محسن الملک اور وقار الملک کے زمانے میں بھی اس کے کوئی آثار نہیں تھے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں گے لہٰذا اس وقت صرف جداگانہ انتخابات اور تعداد نمائندگی میں توازن پر زور رہا۔ علامہ اقبالؒ کے زمانے میں صوبائی خودمختاری یقینی ہو چکی تھی اور کامل آزادی کا مطالبہ زبانوں پر تھا، اس لئے انہوں نے شمال ومغرب میں مسلم اکثریت کے صوبوں کو متحدہ ریاست کا خیال پیش کیا۔ اس کی تائید میں انہوں نے کہا:

"ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے باشندوں میں اپنی جمعیت کے اندر سب سے زیادہ باہم یکساں، یک جنس مسلمان ہی ہیں اور کوئی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جن کو اس لفظ کے جدید ترین معنی میں قوم کہا جا سکتا ہے۔ ہندو اگرچہ ہر چیز میں ہم سے آگے ہیں مگر وہ اپنے اندر وہ یکسانیت پیدا نہیں کر سکے جو ایک قوم کے لئے ضروری ہے اور جو اسلام نے آپ کو مفت میں تحفے کے طور پر عنایت کر دی ہے۔"

علامہ اقبالؒ نے بڑی قوت سے دعویٰ کیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور یہ بھی کہا کہ شمال ومغرب میں مسلم اکثریت کے علاقوں کی ایک متحدہ حکومت ہونی چاہیے خواہ سلطنت برطانیہ کے اندر یا باہر۔ مگر اس وقت مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے مطالبہ کیا کہ آل

پارٹیز مسلم کانفرنس کے ریزولیوشن کا مطالبہ ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ اس وقت بھی اس کے کوئی آثار نہیں تھے کہ انگریز جلد ہندوستان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے، بلکہ کوئی ایسا ہی آئین آنے والا تھا جس میں انگریزوں کا دخل یقینی تھا۔مسلم کانفرنس کے ریزولیوشن کا منشا یہ تھا کہ ایسے ہندوستانی وفاق کے تحت،جس میں اکائیاں (صوبے) مکمل طور پر آزاد اور بااختیار رہوں اور جس میں مرکز ڈھیلا اور اختیارات کے لئے اکائیوں کا محتاج ہو، پورا ہندوستان متحد رہے۔ یہ انگریزوں کی ماتحتی میں داخلی طور پر خودمختار پاکستان ہوتا،لیکن ہندوؤں کی ہر پارٹی،خصوصت سے کانگریس نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ریزولیوشن اور قائداعظمؒ کے 14 نکات کی بڑی شدت سے مخالفت کی اور انہوں نے متحدہ ہندوستان کے لئے وہ طرز حکومت پیدا نہ ہونے دیا جس میں ہندو اور مسلمان امن و امان کے ساتھ رہ سکتے۔بجائے اس کے 1935ء کا وہ آئین آیا جو مسلمانوں کے تمام مقاصد اور تصورات کے لئے تباہ کن تھا۔

قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے درمیان ملاقاتیں بھی ہوتی رہتی تھیں اور خط کتابت بھی جاری تھی۔1936ء میں علامہ اقبالؒ نے اس پر اصرار کیا کہ مسلمانوں کی جداگانہ ریاست کا کھلم کھلا مطالبہ ہو اور اس کے حصول کے لئے عوامی پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کی جائے۔

یہ سب سے پہلے کس نے کہا کہ ہندوستان تقسیم ہو اور اس میں مسلمانوں کی جداگانہ ریاست قائم کی جائے؟ مولانا محمد علیؒ نے، علامہ اقبالؒ نے، عبدالستار خیریؒ نے یا سید جمال الدین افغانیؒ نے؟ تاریخی اعتبار سے یہ دریافت کیسی ہی دلچسپ ہو،لیکن یہ حالت اب پیدا ہوئی کہ مسلمانوں کی جداگانہ اور آزاد ریاست ہوا میں تھی،فضا میں تھی،خیالوں میں تھی،خوابوں میں تھی اور زبانوں پر تھی۔قائداعظمؒ کا یہ خاص طرز قیادت تھا کہ وہ کوئی نئی تجویز اس وقت تک پیش نہیں کرتے تھے جب تک کہ لوگ اس کے لئے تقاضا نہ کرنے لگیں اور لوگوں کے دلوں میں یہ تقاضا وہ خود ہی اشاروں اور کنایوں سے پیدا کرتے تھے۔اب واقعی لوگ تقاضا کر رہے تھے کہ مسلمانوں کی الگ ریاست کا کھلم کھلا مطالبہ کر دیا جائے۔

تاریخ ساز اجلاس

مسلم لیگ کا ستائیسواں سالانہ اجلاس مارچ 1940ء کی 22 تاریخ سے لاہور میں ہونے والا تھا۔ اس کے لئے بڑی تیاریاں تھیں، مگر اس میں ایک بےلطفی ہوگئی۔ یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ حکومت نے ان تمام رضا کار تنظیموں کے مظاہرے اور پریڈیں ممنوع قرار دے دی تھیں جو فوجی یا نیم فوجی وضع کی تھیں۔ خاکسار تنظیم میں فوج کی وردی میں بڑی مشابہت تھی اور اس کا تمام تر مشغلہ قواعد، پریڈ اور فوجی انداز میں سلامیاں تھیں، لہٰذا وہ ممانعت اس پر بھی عائد ہوئی۔ خاکساروں نے لاہور میں اس ممانعت کی خلاف ورزی کی، پولیس سے ان کا تصادم ہوا، پولیس نے گولی چلائی۔ سرکاری بیان یہ تھا کہ بتیس خاکسار جاں بحق ہوئے اور عام خیال یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ۔ یہ حادثہ 19 مارچ کو پیش آیا۔ قائداعظمؒ کو گوارا نہ ہوا کہ حسبِ معمول بحیثیت صدرِ اجلاس ان کا جلوس نکلے۔ وہ بجائے اس کے زخمی رضا کاروں کی عیادت کے لئے ہسپتالوں میں گئے۔ ان کو اس بات کا خیال تھا کہ وہ اختلاف جو حکومتِ پنجاب اور رضا کاروں کے درمیان پیدا ہوگیا تھا، وہ زیادہ نہ بڑھے۔

بہر حال مسلم لیگ کا اجلاس، جس کے لئے بڑا اہتمام تھا، وقت پر شروع ہوا۔ قائداعظمؒ نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا:

"یہ مسئلہ جو ہندوستان میں ہے فرقوں (ہندو، مسلمان) اور علاقوں کے درمیان نہیں، بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس کو بین الاقوامی ہی مان کر حل کرنا چاہیے۔ جب تک یہ بنیادی حقیقت سمجھ میں نہ آئے گی، اس وقت تک کوئی دستور بنانے کا نتیجہ تباہی ہوگا اور یہ صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ ہندوؤں کے لئے اور برطانویوں کے لئے بھی مضر اور تباہ کُن ثابت ہوگا۔ اگر حکومت برطانیہ اس برصغیر کے باشندوں کے لئے یہ چاہتی ہے کہ ان کو امن اور خوشی حاصل ہو اور اس کی یہ خواہش واقعی مخلصانہ ہے، تو اس کی صرف اور صرف یہ ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے دو بڑی اقوام (مسلمان اور ہندو) کے لئے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں،

جن میں وہ خود اختیاری کے ساتھ قومی ریاستیں قائم کریں۔ اس کی کوئی وجہ نہیں کہ ان ریاستوں میں باہم عداوت ہو، بلکہ ان کی یہ رقابت اور یہ طبعی خواہش اور کوشش جاتی رہے گی کہ ایک دوسرے کے اجتماعی نظام پر چھا جائے اور ملک کی حکومت میں سیاسی برتری حاصل کر لے۔ بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے سے ان کے درمیان خیر خواہی اور خیر سگالی پیدا ہو جائے گی اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ وہ امن سے رہ سکیں گے۔ مزید یہ کہ اس سے اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنے میں بڑی آسانی ہوگی۔ ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے درمیان باہمی رضا و رغبت سے معاملات طے ہو جائیں گے اور اس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق و مفاد کی زیادہ موثر طریقہ پر حفاظت ہو جائے گی۔ یہ سمجھنا بہت ہی مشکل ہے کہ اسلام اور ہندومت کی حقیقی فطرت ہمارے ہندو دوستوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ وہ مذہب کے عام مفہوم میں مذہب ہی نہیں بلکہ واقعی دو جداگانہ اور مختلف اجتماعی نظام ہیں۔ یہ محض خواب ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی ایک مشترکہ قوم بن سکیں گے اور ایک ہندوستانی قوم کا یہ مغالطہ حدود سے بہت ہی گزر گیا ہے اور ہماری بہت سی مصیبتوں کا باعث ہے۔ ہم نے جلد اپنے خیالات و عقائد پر نظر ثانی نہ کی تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعلق دو مختلف مذہبی فلسفوں، معاشرتی رواجوں اور ادبیات سے ہے۔ نہ ان کے درمیان باہم شادیاں ہوتی ہیں، نہ یہ ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں دو ایسی تہذیبوں کے پیروکار ہیں جن کی بنیاد ایک دوسرے کے برعکس اور متصادم خیالات اور تصورات پر ہے۔ یہ بالکل واضح ہے کہ وہ تاریخ اور ہے جس پر ہندوؤں کو فخر اور ناز ہے اور وہ تاریخ بھی دوسری ہے جس پر مسلمان نازاں ہیں اور جس سے ان کے دلوں میں حوصلہ اور امید کی لہر اٹھتی ہے۔ ان کے نعرے و ترانے الگ الگ ہیں، ان کے وہ ہیرو اور بہادر مختلف ہیں جن کی یہ تعریف کرتے ہیں اور ان کے وہ واقعات مختلف ہیں جو قابل تقلید ہیں۔ اکثر یہ صورت ہے کہ ایک کے نزدیک شجاعت میں جو مثالی شخصیت ہے وہ دوسرے کی نظر میں دشمن ہے اور اسی طرح یہ بھی ہے کہ ایک کی فتح دوسرے کی شکست ہے۔ دو ایسی قوموں

کو ایک نظام حکمرانی وریاست میں اس طرح باندھنے کا نتیجہ ہے کہ ان میں ایک اکثریت ہو اور
دوسری اقلیت ۔ یہ ہوگا کہ ان میں بے چینی بڑھے گی اور بالآخر وہ نظام تباہ ہو جائے گا۔ تاریخ میں
ایسی بہت سی مثالیں ہیں، جیسی برطانیہ عظمیٰ اور آئرلینڈ اور چیکوسلاواکیہ اور پولینڈ کے اتحادوں
کی۔ تاریخی یہ بھی بتاتی ہے کہ برصغیر ہند کے مقابلے میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے جغرافیائی
رقبے جو یکجا رہنے کی صورت میں ایک ملک کہے جاتے تھے، اتنی ہی ریاستوں میں تقسیم کر دیئے
گئے جتنی ان میں قومیں آباد تھیں۔ جزیرہ نمائے بلقان میں سات سے آٹھ خودمختار ریاستیں ہیں۔ مگر
ہندوستان کے اتحاد کے لئے اور ایک قوم کی بنیاد پر جس کا کوئی وجود نہیں، یہ کوشش کی جارہی
ہے کہ ایک مرکزی حکومت ہونی چاہیے حالانکہ 12 سو برس کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ اتحاد قائم نہیں
ہو سکا اور ہندوستان ہمیشہ ہندو اور مسلم ہندوستان میں تقسیم رہا۔ ہندوستان کا موجودہ مصنوعی اتحاد
صرف اس وقت سے ہے کہ انگریزوں نے اس ملک پر تسلط حاصل کیا اور یہ برطانوی سنگینوں
سے قائم ہے۔ لیکن جہاں برطانوی حکومت ختم ہوئی، جس کا شاہ برطانیہ کی گورنمنٹ کے حالیہ
بیان میں اشارتاً ذکر ہے، ایسی بڑی ٹوٹ پھوٹ ہوگی اور ایسی سخت تباہی کے ساتھ کہ مسلمانوں
کے زیرنگیں گزشتہ دس ہزار برس میں ہندوستان میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہ بڑا ''ورثہ'' ہوگا جو
ڈیڑھ سو برس کی حکومت کے بعد اہلِ برطانیہ ہندوستان کے لئے چھوڑنا پسند کریں گے۔ نہ ہندو
اور نہ مسلمان اس بربادی کا خطرہ گوارہ کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ مسلم ہندوستان کوئی ایسا
دستور قبول نہیں کرے گا جو لازماً ہندو اکثریت پر منتج ہو۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اگر کسی ایسے
جمہوری نظام کے تحت یک جا کیا جائے گا جو اقلیتوں پر مسلط کیا گیا ہو، تو اس کے معنی صرف
ہندو راج ہوں گے۔ جس قسم کی جمہوریت کانگریس کی اعلیٰ قیادت چاہتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا
کہ اسلام کو بہت نقصان ہوگا۔ گزشتہ ڈھائی سال کے اندر ہمیں صوبائی دستوروں کا خوب تجربہ ہو
چکا ہے۔ ایسی حکومت کا اگر پھر اعادہ کیا گیا، تو خانہ جنگی ہوگی اور ایسی نجی فوجیں بھرتی کی جائیں گی
جن کے لئے مسٹر گاندھی نے سکھر کے ہندوؤں سے کہا ہے کہ ''اپنی حفاظت کریں، خواہ عدم تشدد

سے یا تشدد سے، چوٹ کے بدلے میں چوٹ سے، اور اگر تم سے یہ نہ ہو سکے تو سندھ سے نکل کر ہندوستان میں آباد ہو جائیں گے۔ جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے اور سمجھا جاتا ہے، مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ ذرا کوئی آنکھیں کھول کر دیکھے، تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس نقشے کی رُو سے جو برطانویوں نے بنایا ہے، ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار میں مسلمانوں کو کم و بیش غلبہ حاصل ہے۔ اور وہ اس کے باوجود ایسی شاندار حکومتیں چلا رہے ہیں کہ کانگریس کی اعلیٰ ہندو قیادت عدم تعاون اور بغاوت کے لئے تیاریاں کر رہی ہے۔ قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے مسلمان ایک قوم ہیں۔ قوم کے لئے لازم ہے کہ ان کے پاس قومی وطن ہو۔ ان کا اپنا ملک ہو، اور اپنی حکومت اور مملکت ہو۔ ہماری یہ خواہش ہے کہ آزاد اور خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنے ہمسایوں کے ساتھ امن کے ساتھ رہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری قوم اپنے نظریات اور عقائد کے مطابق اور جس طرح ہمارے خیال میں بہتر ہو، روحانی، ثقافتی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ترقی کرے۔ دیانت کا یہ تقاضا ہے اور ہماری قوم کے کروڑوں افراد نے ہم پر یہ مقدس فرض عائد کر دیا ہے کہ ہم کوئی ایسا باعزت اور پُرامن حل نکالیں جو سب کے حق میں منصفانہ ہو، مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ہم پر دھمکیوں اور خوفزدہ کرنے کی کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ جو نصب العین ہم نے متعین کر لیا ہے اور جو مقصد ہمارے سامنے ہے، ان دھمکیوں سے ہم اس کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ جو نصب العین ہم نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں تمام دشواریوں اور نتائج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیے اور وہ تمام قربانیاں دینے کے لئے کمر بستہ رہنا چاہیے، جن کی ضرورت ہو۔''

وہی بات جو تجویز کے طور پر، ایک امکان کے طور پر، اور حالات کے تقاضے کے طور پر عرصہ دراز سے مسلمانوں کے سامنے تھی، آج قائداعظمؒ نے ایک طے شدہ نصب العین کی صورت میں ان کے سامنا ے رکھ دی۔ مسلمانوں کے صاحبِ فکر و رائے طبقے کو انہوں نے یوں پکارا:

'' دوستو! میں چاہتا ہوں کہ تم قطعی فیصلہ کر لو اور پھر تدابیر پر غور کرو۔ اپنی تنظیم کو مستحکم کرو،

پورے ہندوستان میں مسلمانوں کو متحد کرو، میرا خیال یہ ہے کہ عام مسلمان پوری طرح بیدار ہیں۔ وہ صرف تمہاری رہنمائی اور قیادت چاہتے ہیں۔ اسلام کے خادم بن کر آگے بڑھو اور اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کی تنظیم کرو۔ مجھے یقین ہے کہ تم وہ طاقت بنو گے جس کو ہر شخص تسلیم کرے گا"

رات کو ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا اور دوسرے روز سبجکٹس کمیٹی کا۔ صدر کی تقریر کی روشنی میں ورکنگ کمیٹی نے جو ریزولیوشن مرتب کیا تھا، وہی سبجکٹس کمیٹی کے سامنے آیا۔ اس پر بڑی تفصیل سے بحث ہوئی۔ بعض حضرات نے اس پر اصرار کیا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیت کے حقوق اور مفاد کے تحفظ کے لئے پورا اہتمام کیا جائے۔ جتنا اہتمام اس روزولیوشن میں ممکن تھا، وہ پہلے ہی کر دیا گیا تھا۔ اس میں اس سے زیادہ کی اس وجہ سے گنجائش نہ تھی کہ یہ مسلم قوم کی طرف سے ایک عزم اور ارادے کا اصولاً اور اجمالاً اعلان تھا۔ وہ تفصیلات اس میں بیان کرنے سے کوئی فائدہ نہ تھا جن میں آئندہ حکومت برطانیہ سے یا ہندوؤں سے گفتگو ہونے والی تھی اور جو معاہدات کے ذریعے سے طے ہونے کی تھی۔ 22 مارچ کی رات مسلم لیگ کا عام اجلاس ہوا اور اس میں یہ رزولیوشن پیش ہوا:

"غور وخوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے، اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو: یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت ردوبدل کر کے متصل اکائیوں (صوبوں) کو ایسے منطقے بنا دیا جائے کہ وہ علاقے، جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت میں ہیں، جیسے ہندوستان کے شمالی ومغربی اور مشرقی منطقوں میں، اسطرح یکجا ہو جائیں کہ وہ خود مختار ملک بن جائیں۔

" یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لئے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کے تحفظ کے لئے ان کے مشورے سے بقدر

ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، حسب ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کی حفاظت کے لئے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

"یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کومزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک ایسی سکیم مرتب کرے جس میں اس کا انتظام ہو کہ بالآخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں جیسے دفاع، امور خارجہ، رسل ورسائل، کسٹمز اور دوسرے امور جو ضروری ہوں۔"

مسٹر اے کے فضل الحق نے جو اس زمانے میں بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے، رزولیوشن پیش کیا اور چوہدری خلیق الزمان، ایم ایل اے یو پی نے اس کی تائید کی۔ ان کے بعد مندرجہ ذیل حضرات نے مزید تائید کی: مولانا ظفر علی خان، ایم ایل اے مرکزی (پنجاب)، سردار اورنگ زیب خان، ایم ایل اے (سرحد)، حاجی سر عبداللہ ہارون، ایم ایل اے مرکزی (سندھ)، خان بہادر نواب محمد اسماعیل، ایم ایل اے (بہار)، قاضی محمد عیسیٰ صدر مسلم لیگ بلوچستان، عبدالحمید خان، ایم ایل اے مدراس آئی آئی چندریگر ایم ایل اے (بمبئی)، سر عبدالرؤف شاہ، ایم ایل اے (سی پی)، ڈاکٹر محمد عالم، ایم ایل اے (پنجاب)، سید ذاکر علی (یو پی)، بیگم صاحبہ مولانا محمد علی (یو پی)، مولانا عبدالحامد بدایونی (یو پی)۔

ریزولیوشن باتفاق رائے سے منظور ہوا اور نعروں کے ساتھ اور تبریک وتہنیت کے ساتھ لوگوں کو اس ریزولیوشن کے منظور ہونے پر بڑی خوشی تھی۔ مسلم ہندوستان سے اپنی سلطنت و حکومت جانے کے بعد یہ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو وہ نصب العین ملا جو ان ہی کے لئے تھا اور جس کا حصول محض ان ہی کی جد وجہد پر منحصر تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کے ہاتھ پیر کھل گئے۔ یقیناً یہ آزاد اور خود مختار مملکت ان ہی علاقوں میں بننے والی تھی جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی، لیکن ریزولیوشن کی تائید کرنے والوں میں وہ بھی تھے جو مدراس، بمبئی، سی پی،

یوپی اور بہار کے رہنے والے تھے اور زیادہ وہی تھے۔ انھیں بخوبی علم تھا کہ ہندو اکثریتی علاقے ہونے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے مطلوبہ آزاد ملک پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کا یہ قطعی ارادہ نہ تھا کہ وہ ہجرت کر کے یہاں آئیں گے۔ وہ یہ خوب جانتے تھے کہ ان کو سختیوں اور مصائب میں رہنا پڑے گا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس نئی مملکت کے قیام کے لئے زیادہ جدوجہد ان ہی کو کرنا ہوگی، کیونکہ اس وقت تک اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں میں اس کے لئے اس وجہ سے کوئی طلب نہ تھی کہ ہندو حکومت کی ان زیادتیوں اور زبردستیوں سے ان کو کوئی سابقہ نہ پڑا تھا جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں پر ڈھائی سال تک رہی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ بہت خوش تھے، اور اس وجہ سے خوش تھے کہ یہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا قومی وطن بن رہا ہے، جس میں اسلامی تہذیب وتمدن، ثقافت اور دین کو ترقی دینے کا موقع حاصل ہوگا۔ وہ اس پر نازاں تھے کہ یہ خدمت ان کے ذمے آرہی ہے کہ ہندوستان میں ایک گوشہ اسلام کے لئے محفوظ کردیں۔

خطبۂ صدارت میں، رزولیوشن میں اور اس کو پیش کرنے وتائید کرنے والوں کی تقریروں میں پاکستان کا قطعی ذکر نہ تھا۔ اس رزولیوشن کو محض ''تقسیم ہند کا رزولیوشن'' کہا گیا۔ البتہ بیگم مولانا محمد علیؒ جوہر نے اپنی تقریر میں اس کو پاکستان کا رزولیوشن کہا۔ پھر ہندو پریس نے تو طعن وطنز کے طور پر اس نام کو ایسا اُچھالا کہ زباں زدِ عام ہوگیا۔ بالآخر مسلم لیگ نے بھی رزولیوشن کا نام پاکستان رزیولیشن اور اس مملکت کا نام جس کے قیام کے لئے وہ کوشاں تھی، پاکستان ہی قرار دے دیا۔

قرارداد کے فکری پہلو

اس واقعے کی اشاعت کے ساتھ ہی کہ مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی، برصغیر کے ہندوؤں میں شور وغوغا مچ گیا۔ ہر ہندو لیڈر اس کے خلاف بول رہا تھا اور ہر ہندو اخبار اس کے خلاف لکھ رہا تھا۔ اس تمام واویلے میں پاکستان کے خلاف تین اعتراض ایسے تھے جن کو وہ

بہت وزنی اور لاجواب سمجھتے تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بھارتی حکومتیں، بھارتی دانشور اور پاکستان میں موجود بھارت کے تنخواہ دار ایجنٹ آج بھی انہی تین اعتراضات کے حوالے سے دو قومی نظریے اور مسلمانوں کے الگ وطن پاکستان کے وجود کے خلاف سرزہ سرائی کرتے سنائی دیتے ہیں:

1۔ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے، اس لئے وہ تقسیم نہیں ہوسکتا۔

2۔ ہندوستانی مسلمانوں میں کثرت سے وہ ہیں جن کے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ تبدیلی مذہب سے ان کی قومیت نہیں بدل سکتی۔ لہٰذا تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں اور مسلمان ان میں شامل ہیں۔

3۔ پاکستان کے معاشی وسائل اتنے نہیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکے۔

اب ہم ان اعتراظات کا الگ الگ فکری جائزہ لیں گے، کیونکہ بھارت کے ان اعتراضات اور سوچ میں فرق نہیں آیا۔

متحدہ قومیت کا پوسٹ مارٹم

قومیت کی نہایت غلط العام تعریف یہ ہے کہ وہ سب لوگ جن کی نسل ایک ہو، زبان ایک ہو اور وطن ایک ہو ایک قوم ہیں۔ مسلمان اس قومیت اور اس کی اس تعریف کے ہرگز قائل نہیں لیکن پھر بھی اہل یورپ چونکہ اسے مانتے ہیں اور اس وقت ان ہی کے سیاسی عقائد ساری دنیا پر مسلط ہیں، لہٰذا قومیت کے اسی خیال اور اس کی اسی تعریف کی بنیاد پر پورے ہندوستان کے باشندوں کو، جنہیں ہندو ایک قوم کہہ رہے تھے، جانچنا اور پرکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

روایات کی بنا پر ہندوؤں کا یہ دعویٰ ہے کہ کئی ہزار برس ہوئے کہیں باہر سے ہندوستان میں آریہ آئے اور ان لوگوں کو جو پہلے سے ہندوستان میں آباد تھے انہوں نے مغلوب کیا اور ہندوستان کے حاکم بن گئے۔ نووارد آریاؤں نے پیشوں اور کاموں کے اعتبار سے اپنی

جماعت کی تقسیم کی اور تین اعلیٰ ذاتوں میں بانٹا: برہمن، کھشتری اور ویش۔ ہندوستان کی بقیہ آبادی کو انہوں نے شودر کہا، یعنی غلام۔ اس طرح ہندوؤں ہی کی روایات، ہرتاؤ اور قانون کی رو سے برہمن، کھشتری اور ویش آریہ ہیں لہٰذا ہم نسل ہیں اور برِصغیر کی تمام بقیہ آبادی غیر آریہ ہے اس لئے غیر نسل ہے۔ ہندوستان کی آبادی دو نسلوں پر مشتمل ہے، لیکن ہندوستان میں کتنی مختلف نسلوں کے لوگ آباد ہیں؟ انہیں شمار کرنا مشکل ہے۔

جن کو اب کھشتری، ٹھاکر یا راجپوت کہا جاتا ہے، وہ فی الحقیقت ان فاتحین کی اولاد ہیں جو آریاؤں کے بعد برِصغیر پاک و ہند میں آئے اور جنہوں نے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ وہ سیتھی، پہلوا، یونانی اور ہُن وغیرہ تھے۔ ان کے علاوہ جاٹ اور گوجر ہیں۔ گوجر یا گجر نام اس امر کی شہادت ہے کہ یہ جار جیہ یا گرجستان سے آئے ہوں گے۔ برِصغیر میں ان کے نام پر ایک شہر ہے (گجرات) اور ایک صوبہ ہے (گجرات) اور ان کی حکومتیں رہی ہیں۔ پھر میو ہیں، پاسی ہیں، لودھے ہیں، چمار ہیں اور وہ ہیں جن کو سب مانتے اور جانتے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم باشندے یہی تھے یعنی دراوڑ، گونڈ، بھیل، اراون، کول، سنتھال وغیرہ۔ ہندوستان بہت سی مختلف نسلوں کا ایک عجائب خانہ ہے، جن کو ہندوؤں کی ذات پات کی تفریق نے اب تک محفوظ رکھا ہے۔ قومیت کی یہ شرط کہ وہ سب ہم نسل ہوں، مسلمانوں کو الگ کر کے بھی ہندوستان کی اس آبادی پر منطبق نہیں ہوتی جو ہندوئیوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ماہرین لسانیات کی تحقیق یہ ہے کہ برِصغیر میں 33 بڑی زبانیں ہیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں۔ خود بھارت کی حکومت کا عملی کردار اسی کے مطابق ہے۔ وہ زبان ہی کی بنا پر برطانوی عہد کے صوبوں کی کاٹ پھانس کر کے ہند یونین کی ذیلی سٹیٹ بن رہی ہے یا اس پر مجبور کی جارہی ہے کہ ایسا کرے۔ وہ سیاسی ضرورت کے لئے پورے ہندوستان پر ایک زبان مسلط کرنا چاہتی ہے، جس کا نام ہندی ہے۔ مگر جنوبی ہند کو وہ منظور نہیں اور وہ اس پر مرکز کے خلاف بغاوت تک کرنے کو تیار ہے۔

جنوبی ہند کی زبانیں ملیالم، تامل وغیرہ ہیں، جن کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ صرف ہندی نہیں، بلکہ سنسکرت سے بھی الگ، مختلف، زیادہ قدیم اور وسیع ہیں۔ایک قوم ہونے کے لئے اہلِ یورپ کی زبان کی جو شرط ہے وہ ایک نسل ہی کی طرح پاکستان کے قیام کے بعد بھی ان لوگوں پر منطبق نہیں ہوتی جو بھارت میں آباد ہیں۔

ناقابلِ تقسیم کا فلسفہ

اہلِ یورپ کی تعریف کی رُو سے متحدہ قومیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ وہ سب ایک ملک کے باشندے ہوں، یعنی ان کا وطن ایک جغرافیائی وحدت ہو۔وہ پورا برِ صغیر ہند جو قیام پاکستان سے قبل تھا، کس طرح ایک جغرافیائی وحدت ہوسکتا ہے؟ یہ اس وقت تک کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا جب تک کوئی اتنی ہی حرص و ہوس میں مبتلا نہ ہو، جتنی کہ ہندو لیڈروں میں تھی اور اب بھی ہے۔پاکستان کے خلاف بھارت کی جارحیت، بین الاقوامی سرحدوں پر آئے روز کی چھیڑ چھاڑ، کشمیر پر غاصبانہ قبضہ اور پڑوسی ممالک پر غلبہ پانے کے لئے ہولناک اسلحہ کے ڈھیر جمع کرنے کی دُھن جس کی زندہ مثالیں ہیں۔

زمین کی وضع، اس کی پیداوار، درخت، حیوانات، آب و ہوا، انسانوں کے قدوقامت، جسمانی ساخت، رنگ وروپ، عادات وخصائل، یہی عناصر ہیں جن کی بنا پر کسی خطے کو ایک جغرافیائی وحدت قرار دیا جاتا ہے۔اس اعتبار سے برِ صغیر کے وہ صوبے جو انگریزوں کے عہد میں تھے، باہم اس سے زیادہ مختلف ہیں جتنے کہ یورپ کے ملک ہیں۔

یہ درست ہے کہ کوہ ہمالیہ ہندوستان کے شمال میں واقع ہے اور سمندر ہندوستان کو تین طرف سے گھیرے ہوئے ہے، مگر یہ کس نے طے کیا ہے کہ اگر کسی سرزمین کے شمال میں پہاڑ ہو اور اس کے تین طرف سمندر تو وہ ایک ملک ہی ہوتا ہے، براعظم نہیں ہوتا۔کوہ ہمالیہ کے شمال میں بھی میدان ہیں اور ان میدانوں میں کئی ملک ہیں اور اس کے جنوب میں بھی میدان ہیں اور ان میں بہت سے ملک ہیں اس کے علاوہ ہندوستان میں اور بھی پہاڑ ہیں۔جنہوں نے زمین کو مختلف

علاقوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے حالات میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اگر پہاڑوں ہی کو حدِ فاصل قرار دے کر اس سرزمین پر نظر ڈالی جائے جو تقسیم سے قبل ہندوستان کے نام سے مشہور تھی، تو وہ ہندوستان کئی ممالک پر مشتمل ایک برِصغیر تھا۔ لہٰذا برِصغیر پاک و ہند کے باشندے نسل، زبان اور ایک ملک کے باشندے ہونے کی بنا پر ہرگز ایک قوم نہیں۔ البتہ وہ سب جو خود کو ہندو کہتے ہیں ان کے درمیان ہندو مذہب مشترک ہے، لہٰذا وہ مذہب کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ وہ سب جو خود کو مسلمان کہتے ہیں ان کے درمیان مذہب اسلام مشترک ہے اور وہ مذہب اور عقیدے کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ اس طرح برِصغیر پاک و ہند میں دو بڑی قومیں ہیں: ایک ہندو اور دوسری مسلمان، خواہ وہ اس مذہب میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہندو یا مسلمان ہوں یا تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے۔

کسی سرزمین کو ایک ملک اور اس کے باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کا آخری اور بہت ہی غیر طبعی سبب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی اجتماعی مرضی سے وہ ہمیشہ کسی ایسے سیاسی نظام کے ماتحت رہے ہوں جو اُن ہی سے پیدا ہوا ہو۔ ہندوستان میں یہ بھی کبھی نہیں ہوا۔

اندازہ یہ ہے کہ سن عیسوی کے آغاز سے ایک ہزار سال قبل آریہ ہندوستان میں آئے اور یہ مقامی باشندوں کو مغلوب کر کے رفتہ رفتہ آگے بڑھتے رہے۔ غالباً ان کا قبضہ سب سے پہلے اس علاقے پر ہوا ہوگا جو پاکستان ہے۔ لیکن 521 قبل مسیح اور 489 قبل مسیح کے درمیان دارائے اعظم شہنشاہ ایران نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا اور ہزاروں سال تک یہ ایران کا سب سے زیادہ زرخیز صوبہ رہا۔ 325 قبل مسیح میں سکندر نے راجہ پورس کو شکست دی اور سوات سے دریائے سندھ طاس تک اپنا عمل دخل قائم کر کے واپس چلا گیا۔

ہندوستانی فرمانرواؤں میں صرف دو ایسے ہوئے جنہوں نے پورے ہندوستان پر تسلط حاصل کیا: چندر گپت موریا اور اشوک۔ مگر ان کا زمانۂ حکومت زیادہ سے زیادہ نوے سال ہے۔ موریا خاندان کے خاتمے کے بعد ہندوستان پھر سینکڑوں آزاد اور خودمختار حکومتوں میں تقسیم

ہوگیا، جن میں جنگیں ہوتی تھیں اور ایک کا علاقہ دوسرا فتح کرتا تھا۔ پھر ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم آئے۔ علاؤ الدین خلجی کے عہد میں پورا ہندوستان ایک مسلم مرکزی حکومت کے ماتحت متحد ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد پھر کئی مسلم سلطنتوں میں تقسیم ہوگیا۔ خاندان مغلیہ کی حکمرانی کے بعد اکبر کے عہد سے برصغیر ہند کو مغل شہنشاہ کے ماتحت متحد کرنے کی کوشش شروع ہوئی۔ اورنگزیب عالمگیرؒ نے اپنا پورا زمانہ سلطنت جو نصف صدی تھا، اس میں صرف کر دیا انجام یہ ہوا کہ اورنگزیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد سلطنت مغلیہ پاش پاش ہوگئی۔ بے شک انگریزوں نے پورے ہندوستان پر حکومت کی، مگر مسلمان کا اور انگریزوں کا ہندوستان کو متحد کرنا اور کچھ عرصے تک اس کو متحد رکھنا ہندوستان کی طبعی حقیقت اور اس کے تقاضوں کے برعکس فاتحین کی تلوار کے زور سے عمل میں آیا تھا۔ چلتے وقت انگریزوں کو بھی اس حقیقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور وہ ہندوستان کو ان دو قوموں یعنی ہندو اور مسلمان کے درمیان تقسیم کر کے گئے، جن کے الگ اور مختلف ہونے سے انکار حماقت کے سوا اور کچھ نہیں۔

تاریخی کارنامہ

یہ واقعہ بڑا اہم ہے کہ مغربی جمہوریت کے جس اصول کی بنیاد پر ہندو پورے ہندوستان کے اختیارِ حکومت کا دعویٰ کر رہے تھے، اسی کی رُو سے مسلمانوں نے ہندوستان کو تقسیم کرایا۔ ہندوؤں کا دعویٰ یہ تھا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اور مسلمان اقلیت ہیں، اس لئے پورے ہندوستان میں حکومت کا اختیار ہندوؤں کو ملنا چاہیے۔ مسلمانوں نے دعویٰ کیا کہ مسلمان اقلیت نہیں بلکہ جداگانہ قوم ہیں اور ہندوستان ملک نہیں، برصغیر ہے۔ لہٰذا ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے علاقے الگ الگ کر دیئے جائیں، تاکہ دونوں قومیں اپنی اپنی اکثریت کے علاقے میں صاحبِ اختیار رہوں اور دونوں قوموں کے درمیان باہمی معاہدات کے ذریعے پورے برصغیر میں ہندو اور مسلم اقلیتیں امن وعافیت کے ساتھ رہیں۔

مسائل اور وسائل کی جنگ

آخری عذر کہ پاکستان کے معاشی وسائل کم ہیں وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکے گا، اپنی کفالت نہیں کر سکے گا، اس قدر احمقانہ تھی اور ہے کہ ہندؤوں اور ان کے پاکستانی ایجنٹوں کو اس پر شرمانا چاہیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھارتی حکومت نے قیام پاکستان کی راہ روکنے میں ناکامی کا بدلہ لینے کے لئے پاکستان کی معیشت و اقتصادیات کو برباد کرنے کی خاطر ہر حربہ آزمایا۔ پاکستان پر معاشی ضرب لگانے کے لئے ہندوستان میں رہ جانے والے لاکھوں مسلمانوں کو بے گھر کر کے، لوٹ مار کر پاکستان میں دھکیل دیا۔ حکومتِ پاکستان اور اہلِ پاکستان نے انہیں آنکھوں پر بٹھایا اور دل میں جگہ دی۔ پاکستان کے حصے میں آنے والا خزانہ، فوجی و معاشی وسائل پر قبضہ کرلیا۔ اللہ تعالٰی کے فضل وکرم سے پاکستان نے درد بھی سہہ لیا تو دریاؤں کا رخ موڑ کر پاکستان اور پاکستانیوں کو سیلاب بلا سے دوچار کر دیا۔ تائیدِ الٰہی سے پاکستان اس تباہ کن بھارتی منصوبے کے شر سے محفوظ رہا۔ ان تمام محاذوں پر ناکامی کے بعد پاکستان پر جنگیں ٹھونس کر سرے سے (خاکم بدہن) اس کا قصہ پاک کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان میں موجود اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی ہر ترکیب کی مگر اللہ تعالٰی کا عطا کردہ ملک پاکستان آج اس لحاظ سے دنیا بھر میں منفرد ہے کہ اس پر بیرونی دشمن نے ہولناک ترین حملے کئے اور اس کے اندرونی دشمن اس کے وسائل کو انتہائی سنگدلی اور بے رحمی سے لوٹتے رہے، اس کے باوجود پاکستان قائم ہے۔

بے شک یہ ثبوت ہے اس بات کا پاکستان اللہ تعالٰی کا عطا کردہ تحفہ ہے، وہی اس کا حافظ اور مالک ہے۔ پاکستان کو مایوس کن سیاسی حالات اور پریشان کن اقتصادی معاملات کا سامنا رہا ہے اور رہے گا، لیکن اللہ تعالٰی اس کے مسائل کو اس کے وسائل سے شکست دے گا اور انشاء اللہ تعالٰی پاکستان تا قیامت قائم رہے گا!

*****

اسی لئے تو پاکستان بنا

انصار ناصری

...•••...

ایک بار سکندریہ سے آئے ہوئے ایک پروفیسر صاحب نے تقسیمِ ہند کی وجہ دریافت کی جس کے باعث برِ صغیر میں پاکستان اور بھارت، دو علیحدہ ملک وجود میں آئے۔ سکندریہ کے پروفیسر صاحب کا خیال تھا کہ مسلمان اور ہندو قومیں ایک ہزار سال سے بھی زیادہ سے اکٹھے رہ رہی تھیں۔ اتنا طویل عرصہ اکٹھے رہنے کے باعث دونوں قوموں نے خاصی حد تک متحدہ ہندوستانی قومیت کی شکل میں ارتقائی سفر کر لیا تھا اور یہ سفر جاری تھا کہ اچانک مسلمانانِ ہند نے برِ صغیر میں ایک علیحدہ وطن کے قیام کے لئے تحریک شروع کر دی۔ کیا غیر منقسم اور متحدہ ہندوستان ایک بہتر ملک نہیں تھا؟ کیا متحدہ ہندوستان موجودہ پاکستان اور بھارت، دونوں ملکوں سے زیادہ مضبوط اور بہتر ثابت نہ ہوتا وغیرہ وغیرہ۔''

ایک ہزار سال کا عرصہ کسی ملک کی قومیتوں کے لئے بڑا طویل عرصہ ہے کہ وہ باہمی افہام و تفہیم کی راہ پر گامزن ہو کر اپنا ارتقائی عمل جاری رکھیں۔ سکندری پروفیسر صاحب کے ذہن سے یہ بات ظاہر ہو رہی تھی کہ مسلمان اور ہندو دونوں قوموں کے لئے بحیثیت ہندوستانی کئی صدیاں مزید اکٹھے رہنے کا امکان موجود تھا۔ پروفیسر موصوف کی رائے تھی کہ اگر ہندو مسلم قائدین کے درمیان کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی، تو کچھ عرصہ بعد اسے رفع کیا جا سکتا تھا۔ برِ صغیر سے برطانوی حکومت کے نکل جانے کے بعد تمام باہمی شکوک و شبہات اور غلط فہمیاں دُور ہو جاتیں۔ انگریز یقیناً تیسری پارٹی تھے جو اپنے استعماری اغراض و مقاصد کے لئے اپنی رعایا کے مختلف دھڑوں اور گروہوں کے درمیان اختلافات پیدا کر گئے تھے۔ فی الحقیقت برطانوی استعماری

پالیسی ''پھوٹ ڈالو، حکومت کرو'' (DIVIDE AND RULE) تھی۔

پروفیسر موصوف کی اس گفتگو کا انداز بڑا ہمدردانہ اور زوردار تھا۔ مذکورہ سکندری پروفیسر صاحب واحد مثال نہیں ہیں جو اس قسم کے سوالات نہ اٹھاتے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تمام مسئلے میں ایسے لوگ خود اپنے خیالات اور شبہات کی نفی کرتے ہیں۔ یہ سوچ فقط غیر ملکی احباب تک محدود نہیں بلکہ خود پاکستانی شہری جو تعلیم یافتہ بھی کہلاتے ہیں، غیر ملکی احباب کی طرح لاعلم بلکہ تحریکِ قیام پاکستان اور دفاعِ پاکستان کے معاملے میں گمراہ کن منفی معلومات رکھتے ہیں۔

اس سوچ کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں، مگر دنیا ظاہری حالات پر جاتی ہے کتنے لوگ ہیں جو معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی جستجو کرتے ہیں؟ پروفیسر موصوف کے جواب میں میرا نرم، مگر پکا جواب یہ تھا کہ قیام پاکستان کا جواز آپ کے اپنے ایک ہزار سال اکٹھے رہنے کے حوالے میں مضمر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانانِ ہند جو اتنے طویل عرصہ سے ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں، ہندو کی نفسیات کو بہتر جانتے ہیں۔ اگر یہی ہندی مسلمان اپنے لئے ایک علیحدہ وطن کے حصول کے لئے اصرار کرتے ہیں اور اس حکومت کے زیرِ تسلط رہنے سے انکار کرتے ہیں جس کی بھاری اکثریت ہندوؤں پر مبنی ہو، تو یقیناً ان کے پاس بہت مضبوط اور قابلِ قبول وجوہات ہوں گی۔ ان تمام وجوہات کے باوجود مسلمانانِ ہند کس امر کو ترجیح دیتے، کیا وہ ایک چھوٹے مگر آزاد اور خودمختار ملک میں رہنا پسند کرتے یا ایک وسیع سلطنت کے درجہ دوم کے شہری بن کر غلاموں جیسی زندگی گزارنا قبول کرتے؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندو مسلم کے ایک ساتھ رہنے کا نظریہ سوائے ایک تاریخی غلط فہمی کے کچھ نہیں ہے۔ بقائے باہمی کا یہ تاریخی نظریہ انتہائی گمراہ کن ہے۔ ہندو مسلم دونوں قومیں کبھی اکٹھی نہیں رہیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے جدا رہی ہیں۔ مسلمان ہندوستان میں ایک فاتح قوم کی صورت میں وارد ہوئے۔ بعد ازاں ترک النسل غزنوی، غوری، خاندانِ غلاماں اور تغلق آئے جنہوں نے اپنی سلطنت کا دائرہ پورے ہندوستان تک پھیلا دیا۔ مغلوں نے ایک

وسیع ریاست میں حکومت کی، جس کی سرحدیں بلخ سے شروع ہو کر جنوبی ہند کے آخری سرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ بہرحال مسلمان حاکم تھے، خواہ ان کی سلطنت چھوٹی تھی یا بڑی۔ ہندو مفتوح قوم کے لوگ تھے اور ان کے رویئے بھی مفتوحانہ اور غلامانہ تھے۔ کیا اس قسم کے رویئے کو بقائے باہمی یا اکٹھے رہنا قرار دیا جاسکتا ہے؟

ہندوستانیوں نے مسلمانوں کے حملوں سے قبل بھی کئی (قوموں کے) حملے دیکھ رکھے تھے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ حملہ آور اول و آخر، سرتا پیر جنگجو قومیں تھیں جن کے پاس اپنا کوئی دین یا دھرم نہیں تھا۔ ان حملہ آور اقوام کے پاس زندگی کے بارے میں نہ کوئی واضح نظریات تھے اور نہ دنیا اور کائنات کے باب میں کوئی رویئے۔ ان حملہ آوروں کی بھاری اور غالب اکثریت مُلحدانہ اور کافرانہ تھی۔ لہٰذا اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ یہ حملہ آور قومیں چند نسلوں کے بعد ہندوستان میں اپنا علیحدہ تشخص اور شناخت کھو بیٹھیں، مگر مسلمان حملہ آور بالکل مختلف خمیر اور ضمیر کے مالک تھے۔ اس ضمن میں ڈی اے وی کالج سری نگر کے سابق پروفیسر اور بعد ازاں ہندو انتہاپسند عسکری تنظیم آر ایس ایس کے سرکردہ قائد بلراج مدھوک اپنی کتاب "ہندوستان دوراہے پر" میں لکھتے ہیں کہ "مسلمان سے پہلے بھی ہندوستان میں کئی حملہ آور آئے، لیکن یہ سب حملہ آور یعنی یونانی، کشان، ساکا اور ھن وقت کے ساتھ ساتھ معاشرتی اور ثقافتی اعتبار سے ہندوستان کے مفتوح ہو گئے اور اس طرح یہ حملہ آور اقوام مکمل طور پر ہندوؤں میں ضم ہو کر ہندوائی گئیں، لیکن مسلمان حملہ آور کا معاملہ بالکل مختلف تھا کیونکہ یہ خود مشنری رُوح کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے لہٰذا ہندوستانیوں یعنی ہندوؤں کے لئے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ مسلمانوں کو کس طرح مدغم کیا جائے بلکہ ان کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ کس طرح ہندو اپنے آپ کو مسلمانوں، جن کی پشت پر سیاسی قوت بھی تھی، میں مدغم ہونے سے بچائیں۔ لہٰذا انہوں نے وہ علاج اپنایا جو کمزور کا ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنا معاشرتی نظام سخت کر دیا تھا۔ مسلمانوں سے ہر قسم کا لین دین اور تعلق ممنوع قرار دے کر انہیں ملیچھ اور یاونا YAVNAS کا نام دے دیا۔ ہندوؤں میں اس سوچ کی تخلیق اور ترویج کی کہ

ہندو خواہ وہ کم ترین ذات سے تعلق رکھتا ہو، کسی بھی مسلمان سے خواہ وہ بلند ترین اور معزز ترین ذات سے متعلق ہو، بہر حال بہتر ہے۔ اس سوچ نے جو آج بھی جاری ہے، ہندوؤں کا مقصد بخوبی پورا کیا۔ جیسا کہ خود (مولانا) حالی نے کہا ہے کہ سفینۂ اسلام جس نے دجلہ وفرات کو بغیر کسی روک ٹوک کے عبور کیا تھا، گنگا میں آ کر ڈوب گیا۔ یہ اس معاشرتی تفریق وتفاوت کی کہانی ہے جو آج بھی دونوں قوموں میں قائم ہے۔ اگر چہ وہ حالات جنہوں نے اس سوچ کو پروان چڑھایا، مدت ہوئی ختم ہو چکے ہیں" (1)

ریحان الدین البیرونی نے ہندوؤں کی مسلمانوں کے ساتھ علیحدگی اور الگ تھلگ رہنے کی پالیسی کو پروفیسر بلراج مدھوک کی طرح "کمزور کا علاج" یا حفظِ ما تقدم کی پالیسی قرار نہیں دیا، بلکہ ہندوؤں کی اس پالیسی کو مختلف انداز سے دیکھا ہے۔ البیرونی ہندوؤں کو بہت اچھی طرح بلکہ مکمل طور پر جانتے ہیں۔ ڈاکٹر سخاؤ نے البیرونی کے بارے میں لکھا:

"یقیناً ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جو البیرونی سے پہلے یا بعد میں بھی اس سے بہتر ہند شناس ہُوا ہو" (2)

البیرونی ہندوؤں اور ان کے سائنسی اور فنی علوم اور دیگر کارناموں کے بارے میں نہایت قابلِ اعتماد ماہرین میں سے ایک ہیں۔ وہ ہندوؤں کے کارناموں کے چاہنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ہندو قوم کو مندرجہ ذیل انداز میں دیکھتے ہیں:

"ہندو، مذہب کے سلسلے میں ہم مسلمانوں سے یکسر مختلف ہیں۔ جیسا کہ ہم کسی ایسی چیز پر ایمان نہیں رکھتے جس پر ہندو اعتقاد رکھتے ہوں یا معاملہ اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کا تمام مذہبی جوش وخروش اور جوشِ جنون ان لوگوں کے خلاف راہ پکڑتا ہے جو مذہباً ان سے تعلق نہ رکھتے ہوں (یعنی تمام غیر ہندو افراد) ہندو انہیں ملیچھ اور پلید کہتے ہیں۔ ہندو قوم اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے سے بھی روکتی ہے۔ خواہ یہ میل جول باہمی شادیوں کی صورت ہو یا کسی اور رشتے ناتے کی شکل میں۔ مسلمانوں کے ساتھ

اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا تمام ممنوع تھا کیونکہ ان ہندوؤں کا خیال ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ میل جول سے پلید ہو جائیں گے‘‘ (3)

پروفیسر موصوف مزید کہتے ہیں:

’’ہم فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ حماقت ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں ہے اور ہندو اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ دنیا میں کوئی ملک ان کے ملک جیسا نہیں، کوئی دھرم یا مذہب ان کے دھرم جیسا نہیں، کوئی علم و فن ان کے علمی ورثے جیسا نہیں، کوئی قوم ان کی قوم جیسی نہیں اور نہ ہی کوئی بادشاہ اور حاکم ان کے حاکموں جیسا ہے۔ یہ ہندو قوم خود سر، خود غرض، خود پرست، سنگدل اور احمقانہ حد تک مغرور ہے‘‘ (4)

ہندو تمام غیر ملکیوں اور غیر ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ یہ بدیسی پلید، اور ناپاک ہیں اور ان سے کسی قسم کا میل جول انہیں بھی پلید اور ناپاک کر دے گا۔ ہندوؤں کے اس رویّے نے ہندوستان میں مسلم حکومت کے آغاز کے ساتھ ہی جنم نہیں لیا۔ ہندوؤں کا یہی رویہ ہے جو انہوں نے مسلمانوں کے ہندوستان آنے سے بہت پہلے کا اپنا رکھا ہے۔ ہندو معاشرہ ایک منجمد اور مقفل معاشرہ ہے جو کسی دوسرے کو اپنی ثقافت و معاشرت میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

نرادسی چوہدری کی کتاب سرسی کا برِ اعظم (THE CONTINENT OF CIRCE) ہندوؤں کی ذات پات کے ظالمانہ نظام اور برہمنی تسلط کے بارے میں ایک دردناک تحریر ہے۔ اس وقت ہم ہندومت کو تفصیلاً زیرِ بحث نہیں لا رہے بلکہ ہندو مسلم بقائے باہمی یا کیا دونوں قومیں اکٹھا رہ سکتی ہیں؟ کے امکانات پر گفتگو کر رہے ہیں جبکہ مسلمان ذات پات کے باب میں ہندوؤں سے یکسر مختلف خیالات کے حامل ہیں۔

مسلمانوں کے طویل دورِ حکومت میں ہندو بحیثیت ایک قوم مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے۔ انہوں نے اپنے معاشرے کو چاروں طرف سے مقفل کر لیا۔ اپنی بت پرستی بحال رکھی اور

اس طرح اپنی روح پر برہمنی تسلّط کے ساتھ ذات پات کا نظام بھی قائم اور محفوظ رکھا۔ انفرادی تعاون یا معاشرے کے بعض لوگوں کا مصلحت آمیز رویہ اجتماعی اور قومی رویے سے خاصی مختلف اور استثنائی بات ہے۔

برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد ہندوؤں نے اپنی علیٰحدہ قومی روح اور رویّے کا اظہار کیا، اپنی ہندو دھرمی حکومت قائم کرنے کے لئے جدوجہد بھی کی اور ملک کے خاصے بڑے حصے پر اپنا اقتدار بھی قائم کرلیا۔ یہ وہ دور تھا جب اردگرد جنگیں جاری تھیں، افراتفری عروج پر تھی اور انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ہندوستانی حاکموں کے سیاسی امور میں مداخلت شروع کردی تھی۔ فرانسیسیوں نے بالآخر سیاسی مداخلت کی پالیسی ترک کی دی۔ فرانسیسیوں کی پالیسی کی تبدیلی کا بڑا سبب یورپ میں ہفت سالہ جنگ میں ان کی شکست تھا، جبکہ انگریزوں نے (یورپ میں) اپنی برتری منوالی تھی۔ فرانسیسیوں کے ہندوستان سے بحیثیت ایک سیاسی قوت کے اخراج کے بعد انگریزوں نے تمام ہندوستان پر قبضہ جمالیا۔ اس طرح مسلمان اور ہندو دونوں انگریز کی رعایا بن کر رہ گئے۔ کیا دو مختلف قوموں اور دھڑوں کا ایک مشترکہ مقتدر حکومت کی رعایا بن کر رہنے کا مطلب ان (قیدی) قوموں اور دھڑوں کا ایک ہوجانا ہے؟

سادھو سروپ سنگھ اپنی کتاب "سکھ اپنے وطن کا مطالبہ کرتے ہیں" (سال اشاعت 1945ء) میں تحریر کرتے ہیں کہ "اتحاد اور یکتا ایک ساتھ رہنے کے احساس کا نام ہے۔ یکتا اور اتحاد اس کیفیت یا حیثیت کا نام نہیں ہے جو کسی وجہ سے مشترکہ ماحول کے باعث جنم لیتی ہے۔ ہم یقیناً کرنسی کے اشتراک کو اتحاد اور یکتا کا نام نہیں دیتے ہیں۔ جبکہ کرنسی پر ایک ہی حاکم اور بادشاہ کی تصویر ہوتی ہے اور وہ ایک ہی عزت مآب بادشاہ کی ٹکسال سے تیار ہوکر جاری ہوتی ہے۔ اگر ایک تھانیدار پنڈت جواہر لال اور ایک سماج دشمن مجرم کو ایک ہی حوالات میں بند کردے تو یہ کہنا نہ صرف توہین ہے بلکہ غلط بھی کہ حوالات کی قید نے ان دونوں قیدیوں میں باہم اتحاد، یگانگت اور یکتا قائم کردی ہے" (5)

سادھو سروپ سنگھ نے اپنی مذکورہ بالا کتاب کے دیباچے میں ہندوستانی قوم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''مصنف اس امر سے اتفاق نہیں کرتا کہ ہندوستانی ایک قوم ہیں بلکہ اسے ایک من گھڑت افسانہ جانتا ہے ۔ ہندی ایکتا بھارت یعنی ہندوستان میں کبھی نہیں رہی، بلکہ ہندوستان کئی مختلف اقوام کا گھر تھا اور تا حال ہے ۔ ہندی قوم کے بارے میں اس کے برعکس کچھ کہنا نہ صرف سبز باغ دکھانا ہے بلکہ دوسروں کو کُھلا دھوکہ دینا بھی ہے'' (7)

ہندوؤں کی جانب سے ہندی ایکتا کے پروپیگنڈہ تحریک کا حوالہ دیتے ہوئے سادھو سروپ سنگھ مزید لکھتے کہ ''اگر ہم آزاد ہندوستان میں (انگریزوں کی غلامی کے بعد) سیاسی زندگی پر نظر دوڑائیں تو اکثریتی پارٹی کی حکومت سازی جو کہ نمائندہ جمہوریت کے اصولوں میں سے ایک اصول ہے، کرنے کے بارے میں ہندو دیوتائی یقین کے ساتھ کہہ سکتے کہ حکومت ہند (بعد از انگریز) ہندوؤں کے ہاتھ میں آئے گی ۔ کیونکہ ہندوستان میں یہی اکثریتی پارٹی ہے ۔ نتیجتاً ہندو بزور اصرار کے ساتھ تمام تشہیری تدابیر اور پروپیگنڈے کے ذریعے اس مضحکہ خیز امر کا بار بار اظہار کریں گے کہ ہندوستان ایک وحدت ہے اور ہندی قومیت ایک حقیقت --- یہ مفروضہ حقائق کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے اور تاریخ ہند سے معمولی دلچسپی رکھنے والا شخص بھی سرسری نگاہ کے ساتھ اس کے بے ڈھبے پن کی واضح طور پر دیکھ سکتا ہے ۔ وحدتِ ہند کا مفروضہ عموماً ہندوؤں کی جانب سے پیش ہوتا ہے کیونکہ یہ ہندوستان میں اپنی راجدھانی یعنی دارالحکومت کا قیام چاہتے ہیں جو فی الحقیقت ہندو راج یعنی رام راج قائم کرنے کی دیرینہ خواہش ہے'' (8)

ہندی قوم کی ایکتا، اتحاد اور وحدت ہند کے بارے میں یہ تمام پروپیگنڈہ ایک طرف تمام دنیا کو دھوکہ دینے کا ڈھونگ تھا تو دوسری طرف مسلمانانِ ہند کو اکثریتی قوم کی فرمانبرداری قبول کرنے کی دھمکی بھی تھی ۔ حریص ہندو اکثریت سب کچھ اپنے قبضے اور تصرف میں رکھنا چاہتی تھی اور اس طرح مسلمانوں کو بحیثیت ایک قوم ان کے قانونی جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کا

ارادہ رکھتی تھی۔ جبکہ مسلمان بحیثیت ایک قوم ہندوؤں سے تاریخی، ثقافتی اور مذہبی اعتبار سے یکسر مختلف تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جد وجہد آزادی کے پر جوش برسوں میں بھی ہندو قوم نے عملاً ایک جداگانہ اور علیحدگی پسند قوم کی طرح رہنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ ہندو قوم کے بس سے باہر کی بات ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے کی طرح رہ سکیں جسے دیگر اقوام کے ساتھ لے کر چلے۔

ہندوؤں کا جداگانہ طرزِ حیات ان کی فطرت کا حصہ بن گیا اور ان کا یہ عمل ایک صریح حقیقت کے طور پر اس طرح باقی رہا جیسا کہ پہلے تھا۔ وہ مسلمانوں کو زراعت، صنعت، تجارت اور بینکنگ میں پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ بہ مشکل ہی کسی مسلمان کو اس ادارے میں بھرتی کرتے تھے جس میں انہیں تھوڑا بہت بھی اختیار حاصل تھا۔ ہندوؤں کا یہ حال تھا کہ ہندو مسلم یگانگت کے پُر جوش پروپیگنڈہ کے دور میں بھی ہندو وہ کھانا نہیں کھا سکتے تھے جسے مسلمانوں نے چھو لیا ہو۔ یہ ہندوؤں کا اجتماعی رویہ تھا۔ اس رویے کے برعکس کم مثالیں ملیں گی۔ ”ہندو پانی“ اور ”مسلمان پانی“ ابھی تک بھارتی معاشرے میں مروج اور موجود ہے اور ہندو مالک مکان آج بھی کسی مسلمان کو اپنے محلے میں مکان کرایہ پر دینے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود ہندو پروپیگنڈے کے ماہرین آج بھی اپنی پُر جوش تقریروں میں مسلمانوں کو علیحدگی پسند ہونے کا الزام لگاتے رہتے ہیں۔ البتہ ہندوؤں نے اس امر کا عملاً ثبوت دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے نہ صرف ایک اجنبی بلکہ دشمن قوم ہیں۔ انہوں نے معاشرتی زندگی کے تمام معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ اختلاف اور تصادم کا رویہ اپنائے رکھا۔ مسلمانوں نے اتنے شاندار ماضی اور پُر امید مستقبل کی روشنی میں ایک غیر تمدنانہ رویہ اپنایا۔ مسلمانوں نے یہ قومی رویہ طویل اور ٹھنڈے دل سے غور وخوض کرنے کے بعد اپنایا تھا۔ مسلمان قوم کی اکثریت نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سنگدل ہندو اکثریتی قوم کے آگے نہیں جھکے گی۔ انہوں نے ہندو ریاست میں درجہ دوم کے شہری کی حیثیت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یو پی کے ایک ہندو دانشور لیڈر سندر لال نے

1941 میں اجلاس کانگریس جو بمبئی میں منعقد ہوا تھا، کے دوران کہا تھا کہ" دونوں قوموں کے درمیان اختلافات آزادی ہند کی راہ میں ناقابل حل رکاوٹ بن کر کھڑے ہیں۔ یہ حقیقت آپ کو ناپسند ہو سکتی ہے، مگر آپ کو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ہندو خود مطالبہ پاکستان کے، جو بظاہر مسلمانوں کی جانب سے کیا گیا ہے، ذمہ دار ہیں۔ یہ ہندو تھے جنہوں نے پاکستان کا آغاز کیا تھا۔ تمہیں ہر ہندو گھر میں پاکستان نظر آئے گا۔ اگر کوئی غیر ہندو پانی کی طلب میں آپ کے گھر آتا ہے تو آپ اسے اپنے پانی کا برتن بھی دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اگر ہندو کا یہ اجتماعی رویہ نہ ہوتا تو حالات کچھ اور ہوتے"(9)

میں یہاں ایک دوسرے ہندو دانشور کا ذکر کرتا ہوں جو ہندوؤں کے گھمنڈ اور بلا شرکت غیرے رہنے کے عمومی رویے اور معاشرتی کم آمیزی کا "رونا" روتا ہے۔ یہ سکالر سوامی دھرم تیرتھ جی مہاراج ہیں جو" ہندو مت بمقابل انسان دوستی" اور ہندو ثقافت و رسومات کے بارے میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ سوامی جی نہ کبھی مسلمانوں کے مشفق رہے ہیں اور نہ کبھی مسلمانوں کے لئے پاکستان اور ہندوؤں کے لئے بھارت کے نام پر تقسیم ہند کے تصور کے حامی ۔۔۔ البتہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین گونا گوں دوریوں اور اختلافات کی وجوہات کی ضمن میں ہندوؤں کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔ سوامی جی کی نظر میں ہندو تنگ نظر ہے، مسلمان تنگ نظر نہیں۔ سوامی جی لکھتے ہیں:

" مسلمان وسیع ترین بھائی چارے کے پرچارک ہیں۔ وہ تمام انسانیت کو اپنے معاشرتی بھائی چارے کی جانب دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے دینی اور معاشرتی بھائی چارے کے ثمرات سے مستفیض ہونے کے لئے دنیا میں کسی بھی غیر مسلم فرد اور قوم کے ساتھ تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں۔ جبکہ ہندو معاشرتی اعتبار سے نہایت ہی کم آمیزی کے باب میں انتہائی گھمنڈ اور متکبر رویئے کا اظہار کرتے ہیں۔ ہندو اپنے معاشرتی مفادات کے ضمن میں اپنے جدا گانہ اور علیحدگی پسند حلقہ معاشرت میں پیدا ہونے والوں کے علاوہ کسی غیر ہندو کے ساتھ تعاون یا

شرکت کے لئے تیار نہیں ہوتے اس حوالے سے ہندو معاشرتی نظام نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام ہندو اقوام کے لئے بھی ایک توہین ہے۔ ہندوؤں کا یہ روادارانہ معاشرتی رویہ کسی بھی ایسی سکیم کے متضاد ہے جو کسی دوسری قوم کے ساتھ بھائی چارے کے اصول پر استوار کیا جائے'' (10)

ان لوگوں کی تعداد اور اہمیت زیادہ نہیں ہے جو سندر لال اور سوامی دھرما تیرتھ جی مہاراج کی طرح باتیں کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے قومی عیوب اور نقائص کے خلاف باتیں کی ہیں، ہندو معاشرے نے پسند نہیں کیا۔ اس لئے کہ جو کچھ انہوں نے بیان کیا ہے وہ عمومی ہندو معیاری ذوق کے مطابق نہیں ہے۔ ہندوؤں نے لاجپت، سر دیال، شام پرشاد، ساورکی، نارنگ، دیانند، گاندھی اور مدھوک کی سنی اور ان جیسے دیگر ہندو رہنماؤں کی جانب کان دھرے جو ایک طرف پورے ہندوستان میں ہندو بالا دستی اور برتری کے لئے کوشاں تھے تو دوسری طرف مسلمانوں کے جداگانہ تشخص کے خاتمے کے لئے بھی سرگرم عمل تھے۔ میں بلراج مدھوک کا ذکر کرتا ہوں۔ اس بااثر ہندو قائد کا ایک ہی اقتباس مسلمانانِ ہند کے بارے میں ہندو قوم کے بد نیتی پر مبنی عقائد اور عزائم قارئین پر واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ اقتباس جس کتاب سے ماخوذ ہے وہ 1945ء میں شائع ہوئی یعنی تقسیم ہند سے بمشکل ایک سال پہلے۔ "فی الحقیقت یہ بدقسمتی ہے کہ ہندو دھرمی پروہتوں نے بدھ اور دیگر بندوں کی طرح محمد ﷺ کا بت (نعوذ باللہ) بنا کر اپنے ہندو مندروں میں شامل نہیں کیا اور ہندو مت کی دولت مشترکہ میں مسلمانوں کو ایک نئی ذات یا فرقہ بنانے کے لئے سوچ سمجھ سے بالاتر داستان اور دیو مالائی کہانی نہیں گھڑی۔ جیسا کہ ہندو پروہتوں نے ماضی میں یونانی اور ھن قوموں کے باب میں کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس معاملے میں بہت زیادہ مشکلات تھیں، تاہم کوشش ضرور کرنا چاہئے تھی۔ جس دن مسلمانوں کے ہندیائے جانے کی پالیسی مکمل ہو گی اور ان کی ورائے ہند حب الوطنی جڑ سے اکھاڑ باہر پھینک دی جائے گی، اس وقت ہی ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلہ

ختم ہوگا" (11)

پہ تو واضح ہے کہ مذکورہ بالا اقتباس میں لفظ ہندیائے جانے کا مفہوم مسلمانوں کو ہندو بنایا جانا ہے۔ اہلِ پاکستان کو ہندو کے خطرناک عزائم سے آگاہ رہنا چاہیے۔ ہندوؤں نے پاکستان کو ایک حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا اور نہ وہ ایسا کبھی کریں گے۔ لہٰذا ہمیں استحکام پاکستان کی مسلسل مہم بھی اسی استقامت کے ساتھ چلانی چاہیے جس استقامت کے ساتھ حصولِ پاکستان کے لئے تحریک چلائی گئی تھی اور اس کا اوّل و آخر تقاضا یہ ہے کہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی پاکستان کا دفاع مضبوط سے مضبوط رکھا جائے۔ یہ جو دفاعی اخراجات میں کمی کر کے فوجوں اور فوجیوں کو جدید ترین اسلحہ سے محروم رکھ کر اسپرین کی گولیوں اور گلیوں اور مدرسوں کی بات کرتے ہیں، ان کی باتوں پر ہرگز کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ مضبوط ترین افواج پاکستان کی اہمیت و ضرورت خود دشمن واضح کئے دیتا ہے۔ ذرا رام پرشاد مکرجی جو آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے صدر بھی رہے ہیں، کے الفاظ پڑھئے، جن کا بلراج مدھوک نے اپنی کتاب "ہندوستان دوراہے پر" میں حوالہ دیا ہے:

"اگر برطانوی حکومت ہندوستان کی جبری تقسیم کے بعد اپنا تسلط چھوڑ دیتی ہے، تو پھر ہندوستان کی آزاد ریاست کو پورے ہندوستانی علاقوں میں دوبارہ اپنا اقتدار قائم کرنے سے کون روکے گا؟ (12)

حوالاجات

1. Prof. Balraj Madhok, Hindustan on the cross Roads, MEHTA BROTHERS, Lahore, 1945, pp. 12-13
2. Dr. Edward C. Sachau, Albiruni's India' Lahore' 1962; Preface, xxxi
3. Ibid, pp 22-23
4. Ibid, pp 25-27
5. Nirad C. Choudhry, The continent of Circe, Chattow & Windus, London, 1965; p 30
6. Sadhu Swarup Sing, The Sikhs Demand Their

Homeland. Lahore Book Shop, Lahore, 1945; P 30
7. Ibid, p 4
8. Ibid, p 11
9. J.E.Sanjana, Caste and Outcaste, Thacker & Co, Bombay, 1945; pp xv-xvi
10. Swami Dharma Theerthaji Maharaj, The Menace of Hindu Imperialism, Hindu MissionarySociety, Lahore, 1941; p 252.
11. Prof. Balraj Madhok, op.cit; p. 97
12. Ibid, p 55

*****

ایک یادگار تقریر

پروفیسر حسنین کاظمی

...•••...

25 دسمبر 1943ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں نواب بہادر یار جنگ نے ایک رہنما اور عہد ساز تقریر کی۔ جلسہ کی صدارت قائداعظم محمد علی جناحؒ کر رہے تھے۔ تحریک پاکستان اور تاریخ پاکستان کی یہ منفرد تقریر ملاحظہ فرمائیے:

"برادرانِ ملت! مسلم لیگ کا اجلاس ہو چکا اور حسب روایت قدیم میں آپ کو مخاطب کرنے کھڑا ہوا ہوں۔ اس اجلاس کو میں مسلم لیگ کی زندگی کا نیا باب تصور کرتا ہوں اور اس کی منظور کردہ چھ میں سے تین قراردادیں میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ یعنی کونسل آف ایکشن کی قرارداد، پنچ سالہ پروگرام بنانے والی کمیٹی کی قرارداد اور نئے الیکشن کے مطالبہ کی قرارداد۔ آخر الذکر کے متعلق کوئی گفتگو نہیں کروں گا۔ صرف اسی قدر کہنا کافی تصور کرتا ہوں کہ میرے احباب سر فضل حسین کی روحِ پُرفتوح کے لئے چاہے کتنے شکر گزار رہوں پھر بھی اگر نئے الیکشن ہوئے تو بقول غالب

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طُرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مجھے دوسری دونوں قراردادوں کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔ میں ان قراردادوں کو دورِ نو کا آغاز، صبحِ اُمید کا نشان تصور کرتا ہوں، مسلم لیگ کے مستقبل کی درخشانی کی علامت سمجھتا ہوں اور اپنے قائدؒ سے داغ کے الفاظ میں یہ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں:

تیور ترے اے رشکِ قمر دیکھ رہے ہیں
ہم شام سے اندازِ سحر دیکھ رہے ہیں

حضرات! مسلم لیگ کا احیاء اور ترقی ایک فطری احیاء اور فطری ترقی ہے جو بتدریج اور باستقلال عمل میں آئی اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔ اس نے ہماری سیاسی حیات کو اچانک اور یکدم منقلب نہیں کیا بلکہ آہستہ آہستہ ہمیں منزل کی طرف بڑھایا تاکہ ہمارا قدم آگے بڑھے اور ہم پیچھے نہ ہٹنے پائیں۔

دوقومی نظریہ

قائداعظمؒ نے جس وقت لیگ کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لی، ہمارے دماغوں پر مختلف باطل تصورات چھائے ہوئے تھے۔ بہ انداز دوستی ہم کو یقین دلایا گیا تھا کہ ہم دس کروڑ کی تعداد میں ہونے کے باوجود ہندوستان میں ایک اقلیت ہیں۔ یہ احساس کمتری ہمارے ہر چھوٹے بڑے میں سرایت کر گیا تھا۔ قائداعظمؒ نے ہم کو بتایا کہ ہم اقلیت نہیں ہیں۔ دس کروڑ کی تعداد رکھنے والی کوئی جماعت اقلیت نہیں کہلا سکتی۔ تم ایک قوم ہو۔ مستقل قوم، جس کا خمیر اقوام عالم سے بالکل مختلف اور جدا ہے اور جس کی بنیاد و ترتیب، جغرافیہ، نسل و رنگ کی ادنیٰ تفریقات سے بالاتر ہے۔

اقبالؒ کا خواب

جب مسلمانوں میں یہ خیال عام ہو گیا کہ ہم ایک اقلیت نہیں، ہم ایک مستقل قوم ہیں تو انہوں نے ہمیں سمجھایا کہ جس ملک میں دو قومیں آباد ہوں اور دونوں کے مذہبی اور ثقافتی تصوّرات میں زمین آسمان کا فرق ہو تو اس ملک میں جمہوریت صحیح طرز حکومت نہیں ہو سکتی۔ جب اس نظریہ نے بھی مسلم عوام کے دلوں میں جگہ پیدا کر لی تو قائداعظمؒ نے اقبالؒ کے خواب کو آشنائے تعبیر کیا اور ہندوستان کے شمال مشرقی اور شمال مغربی علاقوں میں آزاد مسلم ریاستوں کا مطالبہ کیا جس کو اب عرف عام میں پاکستان کہتے ہیں۔

نعرۂ جنگ

آج سے تین سال پہلے بہت سے لوگ کہتے تھے کہ مسلم لیگ کا یہ مطالبہ پورا نہ ہو سکے گا، لیکن ہندوستان میں کرپس مشن کی آمد اور موجودہ پژ امید حالات نے پاکستان کے عنقریب حاصل ہونے کا یقین پیدا کر دیا ہے۔ مسلمان زیادہ سے زیادہ اس مطالبہ سے وابستہ نظر آ رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا تھا کہ مسلم لیگ اس جنگ کی تیاری کا آخری قدم اٹھائے۔ دہلی میں ہم نے حکومتِ برطانیہ کو آخری تنبیہہ دی اور آج آل انڈیا مسلم لیگ نے کونسل آف ایکشن کی تجویز پاس کر کے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر پاکستان سیدھے ہاتھوں، صلح اور امن سے نہیں مل رہا ہے تو ہم اسے بزورِ بازو حاصل کریں گے۔

حضرات! وہ قائد یا سپہ سالار جس کے سپاہی مفلوج و ناکارہ ہوں، کسی مہم کو کامیابی کے ساتھ سر نہیں کر سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ نعرۂ جنگ بلند کرنے سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ کر لے بلکہ نئی طاقت پیدا کرے اور اس کو اس دن کے لئے تیار کرے جب قائد کی طرف سے کوچ کا حکم ملے۔

میدانِ کارزار

مسلمانانِ ہند! صرف جلسے منعقد کر لینا، تجاویز پاس کر لینا، تقریریں کرنا، تقریریں سننا کسی قوم کی زندگی میں انقلاب پیدا نہیں کر سکتا۔ جہاں تک آپ کے ذہن اور فکر کی تربیت کا تعلق تھا، وہ منزل گزر چکی۔ اب عمل اور صرف عمل کا وقت ہے۔ اگر آپ اس کی طاقت نہیں رکھتے تو پاکستان کا مطالبہ کر کے اس کو ذلیل نہ کیجئے۔ داغ گو شاعرِ بزم تھا مگر بعض دفعہ اس نے بڑے کمال کی باتیں کہی ہیں۔ کہا تو اس نے رندی اور سرمستی کے انداز میں ہے لیکن شاید ہم ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ

نہ تھی تاب اے دل تو کیوں چاہ کی
بڑا تیر مارا اگر آہ کی

اس لئے تیار ہو جاؤ اور اپنے محتاط اور عاقبت بیں قائد کو یقین دلاؤ کہ اس کی پوری قوم ہر مرحلے میں اس کے ساتھ ہے۔قائد اعظم! آپ مایوس نہ ہوں۔آپ کے دوست اور پرانے ساتھی حضرت اقبالؒ نے شاید آپ ہی سے مخاطب ہو کر کہا ہے کہ

مایوس نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

ممکن ہے آپ کو اس طبقے سے آپ کے کام کے آدمی نہ ملیں جس کو اعلیٰ طبقہ کہتے ہیں لیکن آپ کی قوم جانباز سپاہیوں سے خالی نہیں ہے۔

نذرانہ جاں

قائد اعظمؒ! وہ دن میرے لئے عید کا دن ہو گا جس دن ملت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے میں اپنی گرہ کی آخری پائی اور اپنے خون کا آخری قطرہ نچھاور کر کے فخر و ناز کروں گا جس دن میرا جسم زخموں سے چور ہو گا۔(مجمع سے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے: ''ہم آپ کے ساتھ ہیں'')

''حضرات! اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے۔میں نے اپنے جس عزم کا اظہار آج کیا ہے، وہ میرے 12 سال کے شبانہ روز غور و فکر کا نتیجہ ہے۔میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو دیکھو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو، اپنی زندگی کی سرخوشی کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو، اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا بغور تصور کر کے فیصلہ کرو۔مسلمانو! وہ فیصلے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں، بسا اوقات آنی اور اس لئے فانی ہوتے ہیں۔آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت پر پھول بن کر مہکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں۔جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں، جو خود فنا ہوتے ہیں اور پھلوں میں لذت و شیرینی پیدا کرتے ہیں۔ہم کو ان کی ضرورت نہیں، جو کاخ و ایوان کے نقش و نگار بن

کر نگاہِ نظارہ باز کو خیرہ کرنا چاہتے ہوں۔ہم بنیاد کے ان پتھروں کو چاہتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر استحکام عمارات کی ضمانت دے سکتے ہوں۔ میں نے کل کہا تھا اور آج پھر بتا دیتا ہوں کہ

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے

تعمیری لائحہ عمل

حضرات! پاکستان کا حاصل کرلینا اتنا مشکل نہیں جتنا پاکستان کو پاکستان بنانا اور قائم رکھنا مشکل ہے۔آپ کے قائد نے ایک سے زائد مرتبہ اس کا اعادہ فرمایا ہے کہ مسلمان اپنی حکومتوں میں کسی دستور اور قانون کو خود مرتب کرنے کا حق نہیں رکھتے۔ان کا مرتب و متعین دستور ان کے ہاتھوں میں موجود ہے اور وہ قرآن مجید ہے۔کتنی صحیح نظر اور کتنے صحیح فیصلے ہیں۔اس حقیقت سے کوئی انکار کرسکتا کہ ہم پاکستان صرف اس لئے نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی جگہ حاصل کرلیں جہاں وہ شیطان کے آلہ کارین کران ہی دساتیر کافرانہ پر عمل کریں جس پر آج ساری دنیا کاربند ہے۔اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم پاکستان اس لئے چاہتے ہیں کہ وہاں قرآنی نظام حکومت قائم ہو۔ایک انقلاب ہوگا، یہ مسلمانوں کی ترقی کا دور نو ہوگا۔ یہ ایک حیاتِ نو ہوگی جس میں خوابیدہ تصورات اسلامی ایک مرتبہ پھر جاگیں گے اور حیاتِ اسلامی ایک مرتبہ پھر کروٹ لے گی۔ پلاننگ کمیٹی آپ کے لئے جو دستوری اور سیاسی نظام مرتب کرے گی، اس کی بنیادیں کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہوں گی، سن لیجئے اور آگاہ ہو جائیے کہ جس سیاست کی بنیاد کتابُ اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نہیں ہے وہ شیطانی سیاست ہے اور ہم ایسی سیاست سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

(قائد اعظمؒ نے زور سے اور بڑے جوش سے میز پر مکا مار کر فرمایا: "بالکل درست کہتے ہو")

حضرات! لیجئے قائد اعظمؒ نے میرے اس قول پر مُہر تصدیق ثبت کردی۔

اس پلاننگ کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ وہ مسلمانانِ ہند کو عموماً اور مسلمانانِ پاکستان کو خصوصاً پاکستان میں زندہ رہنے کے قابل بنائے اور پاکستان کے لئے خالص اسلامی نقطۂ نظر سے معاشرتی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی نظام عمل مرتب کرے۔ دنیا جانتی ہے کہ دنیا کا کوئی انقلاب عملی صورت نہیں اختیار کر سکتا جب تک پہلے ذہنی حیثیت سے مکمل نہ ہو جائے۔ تاریخِ عالم گواہی دیتی ہے کہ ہر انقلاب کو عملی صورت اختیار کرنے سے پہلے ذہنی انقلاب سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاریخِ انقلاب میں صرف محمدی انقلاب ہی ایک ایسا انقلاب تھا، جس نے بائیس برس کی قلیل مدت میں ان دونوں منزلوں کو طے کیا۔ ذہنی انقلاب پیدا کرنے کی ایک صورت تو یہی اجتماعات اور محفلیں ہیں لیکن انقلاب کو وجود میں لانے کا مستقل اور بنیادی ذریعہ صحیح اور مؤثر تعلیمی نظام کی ترویج ہے۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہی تھی کہ یہاں کا تعلیمی نظام اس قوم نے مرتب کیا جو نہ صرف ہندوستان کی سرزمین اور اس کے معاشی ذرائع پر قابض ہونا چاہتی تھی بلکہ اس کے ذہن و فکر پر بھی اپنا قبضہ جمانا چاہتی تھی۔ اس مقصد کے لئے اس نے ہماری تاریخ کو اس انداز سے ہمارے سامنے پیش کیا جس نے ہم میں خود فراموشی کو بڑھایا اور خود اعتمادی کو گھٹایا، جس نے ہماری مشرقی خصوصیات کو فنا کیا اور ہمیں مغربی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا۔ ضرورت ہے کہ مستقبل کے لائحہ عمل میں سب سے پہلا مقام تعلیمی نظام کو دیا جائے۔ ایسا تعلیمی نظام جس کی بنیاد کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہو۔ جس نظام تعلیم سے گزرنے کے بعد مسلمان کا بچہ اسلامی نظام میں نشوونما پائے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں ملتِ اسلامیہ کی صحیح خدمت انجام دے سکے۔ میں اعلیٰ تعلیم کے مقابلہ میں ابتدائی تعلیم کو زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ ابتدائی تعلیم بنیاد ہے جس کی مضبوطی پر عمارت کے استحکام کا انحصار ہے۔ یاد رکھو قوم کی بے عملی صرف اخلاقی پستی ہی پیدا نہیں کرتی بلکہ اس قوم کی سیاسی غلامی کا سب سے بڑا سبب ہوتی ہے۔ آپ کا فرض ہے کہ آپ اپنے تمام وسائل اس کمیٹی کی کامیابی کے لئے استعمال کریں۔

دوسرا اہم مسئلہ جو اس کمیٹی کے دائرہ کار میں شامل ہوگا، آپ کی معاشی تنظیم کا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ کشمکش سرتا سر معاشی ہے۔ جو لڑائی اس وقت لڑی جارہی ہے، اس کے اسباب پر اگر گہری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا، کہ معاشی اور صرف معاشی مسائل اس کی تہہ میں کارفرما ہیں۔ اسلام کا آفتاب دنیا کے اُفق پر اس وقت طلوع ہوا جب دنیا کے ایک طرف سیم و زر کے فلک بوس پہاڑ تھے اور اس کی دوسری طرف غربت کے غار نظر آرہے تھے۔ نام نہاد پیشواؤں نے مذہب کو آلہ کار بنا کر بنی نوع انسان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور خود ساختہ اصول کے تحت اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز قائم کر رکھا تھا۔ شہنشاہیت اور سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ یک جنبشِ لب لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہہ کر عظمت وجلالِ حق سے باطل کی ساری عمارتوں کو مسمار کر دیا اور تبلیغ و توحید سے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان غاروں کو بھرا جو غربت اور جہالت نے پیدا کر دیئے تھے اور انسانیت کی سطح ایک کر دی تھی۔ محمدِ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محفل میں ہم بلال حبشیؓ کو ہم دوشِ ابوبکر صدیقؓ اور عمار و یاسرؓ کو ہم نشینِ عمر ابنِ خطابؓ دیکھتے ہیں، امتناعِ سود سے سرمایہ داری کی جڑیں کٹ گئیں۔ وراثت کے قانون نے دولت کے جمع ہونے کے راستے روک دیئے۔ زکوٰۃ نے اس دولت کو جو کسی نہ کسی طرح ان مواقع کی موجودگی میں جمع ہوتی، جبراً تقسیم کر دیا اور جمع مال کی مذمت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین نے مدینہ میں عہدِ رسالتؐ کے آخری ایام کو غریب و مسکین کے وجود سے خالی کر دیا۔ ''زمین اللہ کی'' کا قرآنی پیغام سنا کر نبی اُمیؐ نے زمین کی ملکیت صرف اللہ اور اس کے خلیفہ یعنی اسلامی سٹیٹ کے لئے مخصوص کر دی نہریں، جنگل، معدنیات وغیرہ یہ سب سٹیٹ کی مشترکہ ملکیت قرار پائے اور کسی فردِ واحد کو یہ حق نہ رہا کہ ان کے ذریعہ دولت کے ڈھیر جمع کرے۔ زکوٰۃ کے تعلق سے اجمالاً و اشارتاً یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ یہ اسلامی ٹیکس آمدنی پر وصول نہیں کیا جاتا بلکہ سرمایہ سے وصول کیا جاتا ہے اور ان سارے ٹیکسوں سے بڑھ جاتا ہے جو آج ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد انسانیت نے اپنی ترقی یافتہ ضرورتوں کے مدِنظر

وضع کئے ہیں ۔ کیا اس نظام کی موجودگی میں کسی اور معاشی نظام کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کی بھی ضرورت ہے؟

میں محسوس کر رہا ہوں اور پوری شدّت کے ساتھ محسوس کر رہا ہوں کہ روس کی اس جنگ میں انگلستان کے ساتھ شرکت نے ہندوستان کے لئے کمیونزم کی تبلیغ اور دعوت کے دروازے کھول دیئے ہیں ۔ کیمونسٹ مبلغین کو موجودہ گرانی اور قلتِ اجناس نے موقع بہم پہنچایا ہے کہ غریبوں کے سامنے روٹی، کپڑے اور مکان کا نعرہ بلند کر کے ان کو کیمونزم کی طرف گھسیٹیں۔ میں اپنے نوجوانوں کو ہندو نوجوانوں سے زیادہ اس مذہب معاش کی طرف متوجہ ہوتا دیکھ رہا ہوں ۔ اگر کیمونزم کے معنی صرف یہ ہیں کہ دنیا سے غربت و افلاس کو مٹایا جائے اور ہر انسان کو روٹی اور کپڑا مہیا کیا جائے تو میں اپنے آپ کو سب سے بڑا کیمونسٹ کہہ سکتا ہوں اور اگر اس کے پیچھے یہودی کارل مارکس کا وہ فلسفہ کام کر رہا ہے جس کی بنیاد انکارِ اللہ پر ہے تو میں کیمونزم سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں ۔

نصف صدی، حد یوں نصف صدی قبل علامہ اقبالؒ نے تو کیمونزم کے بارے میں واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس کی عمر ستر برس سے زیادہ نہ ہوگی (آفرین ہے ۔حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی مومنانہ بصیرت پر! کیمونزم اپنے وجود کے ٹھیک ستر برس بعد زمین بوس بلکہ پیوندِ زمین ہوگیا ۔۔۔مرتب)

اسلام کی بنیاد وجودِ باری کے عقیدے پر رکھی گئی ہے اور اگر مسلمان اس سے ہٹ رہا ہے تو اسلام سے ہٹ رہا ہے، سیدھے راستے سے ہٹ رہا ہے، خیر سے ہٹ کر شر کی طرف جا رہا ہے، سلامتی کی منزل سے منہ موڑ کر تباہی کے غار میں گرنا چاہتا ہے ۔ میں اس اجلاس میں اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے پنڈال سے وہ لوگ اُٹھ جائیں جو خدا کے انکار پر اپنے معاشی نظام کی بنیاد رکھتے ہیں ۔قرآن کے واضح اور اٹل احکامات میں تحریف و اضافہ کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور جو روٹی کپڑے کے بدلے مسلمان کا ضمیر اور اس کا ایمان خریدنا چاہتے ہیں ۔

(مجمع سے بے پایاں شور بلند ہوتا ہے: "ہم صرف اسلامی نظام چاہتے ہیں)

مجھے یقین ہے کہ ہماری پلاننگ کمیٹی جب پاکستان کے لئے معاشی نظام مرتب کرے گی تو اس کی بنیاد قرآنی و اسلامی نظام معاشی پر ہوگی۔(قائدِ اعظمؒ زندہ باد کے فلک شگاف نعرے)

جناب قائدِ اعظمؒ! میں نے پاکستان کو اسی طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے۔

(قائدِ اعظمؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: آپ مجھے قبل از وقت کیوں چیلنج دے رہے ہیں)

نہیں، قائدِ اعظمؒ! میں چیلنج نہیں دے رہا ہوں۔ میں اس چیلنج کے ذریعے آپ کے عوام کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ آپ ایسا ہی پاکستان چاہتے ہیں جس کا اس وقت اجمالی تصور پیش کیا گیا ہے۔

نشاۃِ ثانیہ

برادرانِ ملت! یاد رکھئے پلاننگ کمیٹی کا تقرر آپ کی سیاسی زندگی کی نشاۃِ ثانیہ یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی ہے۔ وہ قوم جو تعلیمی اور معاشی حیثیت سے آزاد نہیں ہے، سیاسی حیثیت سے کبھی آزاد نہیں ہوسکتی۔ تعلیمی اور معاشی غلامی کے ساتھ سیاسی آزادی غلامی کی بدترین قسم ہے۔

اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے میں آپ کی توجہ اس امر کی جانب خصوصیت سے مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان کا مطالبہ کرکے اگر آپ ایسا ملک چاہتے ہیں جس میں پاک لوگ بستے ہوں اور جو خیالات کے اعتبار سے افکار و اعمال اور کردار کے لحاظ سے پاک ہوں تو میرے دوستو! یاد رکھو کہ جسمانی ناپاکی آسانی سے دُور ہوسکتی ہے لیکن ذہن و فکر اور قول و عمل کی ناپاکی وہ گندگی ہے جس کو دور کرنے کے لئے اللہ نے آپ جیسی ہستیاں پیدا کی ہیں۔ کیا ان ناپاکیوں میں آلودہ ہو کر جھوٹ کو اپنا شعار بنا کر، مکروفریب میں مبتلا رہ کر، جبر اور استبداد کو جاری رکھ کر کیا ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم پاک ہیں اور اگر ہم ان گندگیوں سے پاک نہ ہوئے تو ہمیں ہندوستان کے دونوں گوشوں میں خودمختار حیثیت مل بھی گئی تو کیا وہ پاکستان کہلانے کے مستحق ہوگی؟

پاک بننے کی اس کوشش کو آج سے شروع کرو اور جاری رکھو کہ نہ صرف پاکستان میں

رہنے کے لئے پاک بننے کی ضرورت ہے بلکہ پاکستان کے حصول کے لئے بھی پاک بننے کی ضرورت ہے۔

آپ کی کونسل آف ایکشن کا سب سے پہلا طریقہ ہوگا کہ پاکستان کی جنگ لڑنے والے سپاہیوں کو آج ہی پاک بنانا شروع کر دے۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ اس وقت تک پاک نہیں ہوسکتا جب تک کہ ایک ایک سپہ سالار پاک نہ ہوجائے۔

یادرکھو! اسلام کے عہدِ حاضر کے سب سے بڑے مفکر علامہ اقبالؒ برملا کہہ رہے ہیں کہ

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو غزالیؒ ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی
دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اَولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بُوئے اسدُ اللٰہی

(سٹیج پر بیٹھنے والوں کی طرف مخاطب ہوکر)

اے طائرِ لا ہُوتی اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

نوائے سروش

برادرانِ ملت! اس ناپائیدار زندگی میں انسان عمل سے حیاتِ دوام بخشتا ہے۔ہماری منزل اگر چہ نمایاں نگاہوں کے سامنے آچکی ہے اور ہمیں اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ ہم اپنے عظیم قائدؒ کی رہنمائی میں منزل سے ہمکنار ہوکر رہیں گے،لیکن راستے کے خطرات سے آگاہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وقت کے تندوتیز طوفانوں کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ آزمائش کی کٹھن ساعتوں میں کتنے ہی سپاہی بچھڑ سکتے ہیں۔یہ بھی میری آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو آپ کے مقصد میں عظیم کامیابی عطا فرمائے۔آخر میں اس مختصر سی التجا کے ساتھ جس کی برکات بے اندازہ ہیں، رخصت ہوتا ہوں:

یا ربنا یا ارحم الراحمین
رحم کن برحالِ ما یا رحمۃ اللعالمینؐ

بہادر یار جنگ کی تقریر پر مختار مسعود کا تبصرہ

بہادر یار جنگ کا قد لانبا اور بدن دُہرا تھا۔ وہ خدوخال سے معمر، فربہی سے معتبر اور ملبوس سے معزز نظر آتے تھے۔ لوگ انہیں مقرر کی حیثیت سے جانتے تھے اور عام خیال یہی تھا کہ بے پناہ محنت اور عمل کی جو تلقین اپنی تقریروں میں کرتے ہیں، وہ خود شاید اس سے مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ ڈیما ستھینز نے شجاعت کے بارے میں اتنی شاندار تقریریں کیں کہ ہزاروں آدمی انہیں سن کر میدانِ جنگ میں پہنچے، تو موقع ملتے ہی ڈیما ستھینز فرار ہوگیا۔ یہ فرار ہمیں ہر ناصح، محتسب اور مصلح کی زندگی میں ملتا ہے۔ لوگ حیران ہوئے کہ بہادر یار جنگ گفتار ہی کا نہیں کردار کا بھی غازی ہے۔ اپنے اور بیگانے سبھی دکھ دینے کو تیار ہیں اور یہ اصول کی خاطر ہر امتحان کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بہادر یار جنگ کو جب ایک بار عہدے کی پیشکش ہوئی تو کہا: ”مجھے کرسیٔ وزارت پر بیٹھ کر امورِ مملکت پر غور کرنے کے لئے نہیں بلکہ گردِ کوچہ و بازار بن کر قلوب کی دنیا میں طوفان برپا کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے“ بہادر یار جنگ نے یہ طوفان اپنی تقریروں سے اٹھایا تھا اور اتنے سال گزرنے کے باوجود اس طوفان کی ایک لہر آج بھی میرے دل میں موجزن ہے۔ میں نے انہیں کئی بار سنا تھا، ان کی تقریر کبھی آتش فشاں ہوتی اور کبھی آبشار۔ بعض تقریروں میں یہ دونوں صورتیں جمع ہو جاتیں۔ وہ تقریریں جن میں برِعظیم کی آزادی اور پاکستان کا مطالبہ ہوتا یا فکر و عمل اور سرفروشی اور جانبازی کی تلقین ہوتی، بالکل آتش فشاں کی مانند ہوتی، آگ اور حرارت کا سیلِ بے پناہ جو ہر مقابل پر حاوی ہو جائے اور ہر رکاوٹ پر غالب آ جائے۔ جو تقریریں اسوۂ رسولؐ، مسلمانوں کی نا مسلمانی، ایمان کی کمزوری، اتحاد کی کمی، فکرِ صحیح سے محرومی اور راہِ حق سے انحراف کے بارے میں ہوتیں، وہ ایسے آبشار کی طرح تھیں جو یہ کہتے ہوئے نیچے گر رہا ہو کہ تم میری سطح تک بلند نہیں ہوتے تو میں کشتِ ویراں کو بلندیوں سے اُتر کر سیراب کرتا ہوں۔ عام طور پر جذباتی تقریریں جب تحریر میں لائی جاتی ہیں تو وہ بہت معمولی لگتی ہیں۔ کسی

واقعہ یا حادثہ کی نسبت سے کی ہوئی دھواں دھار تقریر پر جب کچھ وقت بیت جائے اور اسے پڑھنے والا ذہنی طور پر اس لمحے سے بہت دور ہو جائے جو سامعین کو میسر تھا تو ایسی تقریر بجھی ہوئی آگ کے دھوئیں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یوں بھی مقرر کی ذات، صفات، انداز اور آہنگ سے تقریر میں تاثر پیدا ہوتا ہے اور تحریر میں ان کی غیر موجودگی سے جو کمی واقع ہوتی ہے، وہ وقت کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک مدت گزرنے کے بعد تقریر پڑھنے کی چیز ہی نہیں رہتی۔ جو تقریر اس اصول سے مستثنیٰ ہو، اسے کلاسیک میں جگہ مل جاتی ہے۔
ایک دوست نے جو یہ رائے سُنی تو پوچھنے لگے کہ یہ جب ہم تم بہادر یار جنگ کے جلسوں میں پروانہ وار جاتے تھے اور ان کی تقریروں پر دیوانہ وار سر دھنتے تھے، وہ کہاں تک جائز تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم ایک لمحے کے جادو اور ایک یادداشت کے فریب میں آ کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ بہادر یار جنگ سا مقرر نہ دیکھا اور نہ سنا۔ میرے یہ دوست عمر کے اس حصے اور عہدے کے اس درجے پر ہیں جہاں سوچ کی نہج بدل جاتی ہے اور سارا ماضی مشتبہ اور مشکوک نظر آتا ہے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ بہادر یار جنگ کی ایک مشہور تقریر کا تجزیہ کروں گا تا کہ ان کی تسلی ہو جائے۔

بہادر یار جنگ نے اپنے خطوں کی نقلیں محفوظ رکھیں مگر ان کی تقریروں کا کوئی مجموعہ نہیں ملتا۔ ان کی صرف دو چار تقریریں محفوظ ہیں اور ان میں وہ تقریر بھی شامل ہے جو 26 دسمبر 1943ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے موقع پر کراچی میں کی گئی تھی۔ یہ بلاشبہ ان کی نہایت کامیاب سیاسی تقریر ہے۔ میں نے اس تقریر کا تجزیہ اپنے دوست کو پیش کیا تا کہ وہ اپنے ماضی سے اتفاق رائے کر لیں۔ بہادر یار جنگ نے یہ تقریر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی آخری روز کی تھی۔ یہ اس اجلاس کی آخری تقریر ہو گی۔ اس کے بعد سال بھر تک ایسا موقع نہ آئے گا اور کسے خبر تھی کہ اس وقت یہ مقرر موجود نہ ہو گا۔ تقریر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دم کو غنیمت جان کر بول رہے ہیں اور ذرا دیر میں برخاست ہونے والے اجلاس کے سامعین سے دل کھول کر ایسی باتیں کرنا چاہتے ہیں جن کا تاثر اگلے اجلاس تک ہی نہیں بلکہ مستقل اور مسلسل ہو۔

زمانے کے اعتبار سے یہ تقریر قرارداد پاکستان کی منظور کے چار برس بعد کی جاری تھی۔تحریک پاکستان مقبول ہو چکی تھی۔محمد علی جناح اب قائداعظمؒ کہلاتے تھے۔تحریک جواں تھی اور قائداعظمؒ جواں ہمت تھے۔مگر رہ رہ کر یہ خیال بھی آتا تھا کہ عمر کے لحاظ سے قائداعظمؒ ضعیف ہیں، اگر انہیں کچھ ہو گیا تو تحریک کو ضعف آ جائے گا۔کہیں ایسا تو نہ ہوگا کہ مسائلِ ہند کے آخری سیاسی فیصلے کے وقت اس قرارداد سے محض ترازو کے پاسنگ کا کام لیا جائے گا۔کبھی یہ شبہ بھی ہونے لگتا کہ اتنی بڑی تحریک کی کامیابی کے لئے ایک طویل جد و جہد درکار ہو گی اور اتنا عرصہ لوگوں کے دلوں کو اسی طرح گرمائے رکھنا کیونکر ممکن ہوگا۔ بہادر یار جنگ کی تقریر میں بے یقینی کے بجائے ایک غیر متزلزل یقین ملتا ہے اور وہ سامعین کے جذبات کو سدا اس درجہ حرارت پر دیکھنا چاہتے ہیں جس کا نام اسلام ہے۔اس تقریر کا خلاصہ ایک جملہ میں یوں کیا جا سکتا ہے کہ پاکستان برحق ہے اور آج نہیں تو کل بن جائے گا۔اس کے حصول کے لئے مسلسل عمل اور اس کے قیام اور بقاء کے لئے انقلاب محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضرورت ہے۔

تقریر کے دو حصے اور ہر حصے کے تین ذیلی حصے ہیں۔اگر ان کے عنوانات قائم کئے جائیں تو کچھ یوں ہوں گے:

پہلا حصہ حصولِ پاکستان دوسرا حصہ قیام پاکستان۔

پہلے حصے کے ذیلی عنوانات صبح اُمید، روزِ عمل، اور پیشکش ہوں گے۔دوسرے کے دستور، نظامِ تعلیم اور نظام معاش۔ختم کلام کا عنوان اتباعِ سنت ہو سکتا ہے۔

خرد اور جنوں کا جو امتزاج اس تقریر میں ملتا ہے، اس کی مثال اردو ادب میں جو چند تقریریں محفوظ ہیں، ان میں نہیں ملتی۔

یہ تقریر دھیمے انداز سے شروع اور اسی انداز سے ختم ہوتی ہے۔ پہلا وار ناصحانہ ہے اور اس کے لئے غالب کا شعر منتخب کیا ہے۔آخری وار طنزیہ اور حکیمانہ ہے، جس کے لئے اقبالؒ کا سہارا لیا ہے۔غالب اور اقبالؒ کے درمیان جو مسافت ہے، اس میں تین مرتبہ جوش بڑھتا ہُوا

ایک نقطۂ عروج پر جا پہنچتا ہے مگر چوتھی بار نقطۂ عروج اچانک آہستگی سے آ جاتا ہے اور تقریر وہیں ختم ہو جاتی ہے۔ دو نقطہ ہائے عروج پاکستان سے متعلق ہیں اور دو ملی حمیت کے بارے میں۔ ایک بار دو قومی نظریئے کی حمایت کرتے ہوئے یہ اعلان کرتے ہیں کہ اگر پاکستان بہ التجا نہیں مل رہا تو ہم بزور حاصل کریں گے۔

تقریر کے دوسرے حصے میں مسلم لیگ پلاننگ کمیٹی سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایسی تجاویز مرتب کرے جو پاکستان اور اسلامی دستورِ حیات، اسلامی نظامِ تعلیم اور اسلامی معاشی نظام کے رائج کرنے میں مددگار ہوں۔ اس موقع پر قائداعظمؒ کو اس طور سے مخاطب کیا جس کی جرأت قائداعظمؒ کی زندگی میں کسی اور کو نہ ہو سکی۔ کہنے لگے کہ "قائداعظمؒ میں نے پاکستان کو اس طرح سمجھا ہے اور اگر آپ کا پاکستان یہ نہیں ہے تو ہم ایسا پاکستان نہیں چاہتے"۔ مقرر کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف پاکستان بزور حاصل کرنے کا عزم ہے اور دوسری طرف پاکستان ملے تو لینے سے انکاری ہیں۔ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور دونوں میں زورِ بیان انتہا پر ہے۔ لوگ پہلی صورت میں بھی اتنے ہی پُر جوش ہو جاتے ہیں جتنا دوسری صورت میں۔ ایک مختصر تقریر میں سامعین کے جذبات کو یوں قطبین تک لے جانا اور واپس لے آنا مقرر کے فن کا کمال ہے۔

اس تقریر کا سب سے مؤثر حصہ وہ اعلان ہے جو مسلم لیگ کی کونسل آف ایکشن کو اپنی خدمات پیش کرنے کے متعلق ہے۔ تقریر کا ایک عامیانہ انداز یہ ہے کہ مقرر اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کی تلقین یا وعدہ کرتا ہے، چند نعرے اس موقع پر لگ جاتے ہیں اور بات رفت و گزشت ہو جاتی ہے۔ بہادر یار جنگ پہلے ہی مال و جاہ کی قربانی دے چکے تھے اور زباں بندی کی پابندی بھی سہہ چکے تھے۔ ہر شخص ان کی ان قربانیوں کا قائل تھا مگر وہ خود انہیں ناکافی سمجھتے تھے اس لئے ہزاروں کو گواہ بنا کر اجلاس میں ایک نیا عہد کرتے ہیں۔ اس کے گواہوں میں قائداعظمؒ، سامعین، سورج اور فرشتوں کو شامل کیا مگر اس پر اکتفا نہ کی اور خدائے قادر و قیوم کو حاضر و ناظر جان کر عہد کیا کہ ملتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کے راستے میں جس دن ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں ہوں گی اور جسم زخموں سے چُور ہوگا، وہ ان کے لئے عید کا دن ہوگا۔

سامعین گرما گئے، زندہ باد کے نعرے لگے، سبحان اللہ اور مرحبا کی آوازیں آئیں، سب نے بیک آواز کہا کہ وہ بھی اس راہ میں مقرر کے ساتھ قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ ایک ایسی تقریر جس پر مقرر غور و فکر کر چکا تھا اور سامعین اس کے ایک نقطہ عروج پر پہنچ کر مقرر کو اپنی خدمات پیش کر رہے تھے۔۔۔ یکا یک مقرر اور سامعین کے ایک فی البدیہہ مکالمہ سے تاثر اور کامیابی کی انتہائی منزل پر جا پہنچی۔ تقریر کے اس حصہ کا اقتباس اگرچہ قدرے طویل ہے مگر بہادر یار جنگ کی ذات اور ان کے فن خطابت کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور اقتباس نہیں ہوسکتا۔ جونہی مجمع سے آوازیں آئیں کہ ہم بھی آپ کے ساتھ قربانی دینے میں دوش بدوش ہوں گے۔ بہادر یار جنگ نے کہا: "اس قدر جلد فیصلہ نہ کیجئے میں نے اپنے جس عزم کا آج اظہار کیا ہے، وہ میرے بارہ سال کی شبانہ روز غور و فکر کا نتیجہ ہے، میں نے اس کی تیاری کی اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا ہے" جاؤ اپنی بیویوں کے تابناک چہروں کو، اپنے بچوں کی مسکراہٹ کو آنکھوں کے سامنے رکھ کر فیصلہ کرو۔ اپنی تجارت اور ذرائع معیشت کی ساری تباہیوں کا تصور کر کے ایک مرتبہ فیصلہ کرو۔ مسلمانو! وہ فیصلے جو جوش کے عالم میں دوسروں کی تقلید میں کر دیئے جاتے ہیں بسا اوقات آنی اور اس لئے فانی ہوتے ہیں۔ آج ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے جو شجر ملت پر پھول بن کر چمکنا چاہتے ہوں اور پھل بن کر کام و دہن کو شیریں کرنا چاہتے ہوں۔ ہمیں ان کی ضرورت ہے جو کھاد بن کر زمین میں جذب ہوتے ہیں اور جڑوں کو مضبوط کرتے ہیں جو مٹی اور پانی میں مل کر رنگین پھول پیدا کرتے ہیں جو ہمیشہ کے لئے زمین میں دفن ہو کر اور مٹی کے نیچے دب کر اپنے اوپر عمارت کی مضبوطی کی ضمانت قبول کرتے ہیں۔"

میرے دوست نے جب یہ سنا تو کہنے لگے کہ یہ شخص بڑے غضب کا نکلا۔ ایک عظیم خطیب اور ایک عظیم تر انسان، گفتار میں فرد اور کردار میں مرد۔ طالب علمی کے زمانے میں ہم نے انہیں

جو کچھ سمجھا تھا، ان کے مرتبہ سے کم تھا۔ افسوس کہ ہم ان کے مقام اور ان کی منزل کو نہ پہچان سکے۔ بہادر یار جنگ نے جامعہ عثمانیہ کے ایک استاد کو ایک خط میں لکھا: ''اب سنیئے میری منزل کیا ہے؟ میری منزل مسلمانوں کو منفرداً اور جماعت اسلامیہ کو مجتمعاً منہاج نبوت پر دیکھنا ہے۔ میرا عمل، میری مجلس کی قراردادیں اور میری تقاریر اس اجمال کی تفصیل ہیں۔ گو ہمت عالی کے نزدیک یہ منزل بھی سنگِ میل ہے اور حقیقی تاج خلافتِ الہیٰہ کا زیب سر کرنا اور فرشتوں کو اپنے سامنے سجدہ ریز دیکھنا ہوسکتا ہے۔

میرے دوست جذبات سے مغلوب ہو گئے اور زیرِ لب بولے، کیا جب کسی فرشتہ نے خدا سے التجا کی ہو کہ محمد بہادر خان کی آخری خواہش بھی پوری ہونی چاہیے''

(منقول از ''آواز دوست'')

*****

مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش تک

سینیٹر (ر) محمد اکرم ذکی (سابق سیکرٹری جنرل، وزارت خارجہ۔ پاکستان)

...•••...

ڈھاکہ یونیورسٹی میں پروفیسرز اور دانشوروں سے خطاب کرتے ہوئے بھارتی وزیر اعظم نریندر مودی نے احساس تفاخر میں انتہائی رعونت کے ساتھ اعلان کیا کہ بھارت نے سب سے پہلے اپنی کمانڈو فورس مکتی باہنی کی شکل میں پاکستانی فوجوں سے لڑنے کے لئے مشرقی پاکستان میں داخل کی تھی۔ بھارت نے پاکستان کو دولخت کر کے بنگلہ دیش کو ایک آزاد ملک بنایا۔قرون وسطیٰ کی ذہنیت سے تو یہ کامیابی کا دعویٰ تھا،مگر عصر حاضر میں اقوام متحدہ کے چارٹر اور بین الاقوامی قوانین کی سنگین خلاف ورزی ہے۔مودی نے طاقت کے تکبر میں یہ دعویٰ کر کے دراصل اقبال جرم کیا ہے اور مستقبل سے متعلق اپنے مذموم عزائم کی بھی عکاسی کی ہے۔ بھارتی وزیر اعظم کے اس اقرار جرم پہ دنیا کو حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی دنیا پر یہ آشکارا ہو چکا تھا کہ بھارت نے پاکستان کے آزاد اور خودمختار وجود کو دل سے قبول نہیں کیا اور اس کے خلاف سازشوں کی فصل بو دی ہے۔آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 14 جون 1947ء کے اجلاس پاکستان سے متعلق اپنے مستقبل کے عزائم کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ متحدہ ہندوستان کا تصور قائم رہے گا۔ایک وقت آئے گا جب دو قومی نظریہ باطل اور غیر معتبر قرار پائے گا اور مسترد ہو گا۔ یہ بیان کسی فرد واحد کا ذاتی خیال نہیں تھا، بلکہ اس جماعت کا پالیسی بیان تھا جس نے بھارت پہ آئندہ حکومت کرنی تھی۔ یہ سوال بہر حال اپنی جگہ اہم ہے کہ نریندر مودی کو بنگلہ دیش میں اس اعتراف جرم کی ضرورت کیوں کر پیش آئی۔ظاہراً اس کے دو مقاصد تھے، اول یہ کہ بنگلہ دیش کی وزیر اعظم شیخ حسینہ واجد کو یہ احساس دلانا کہ

تمہاری وزارت عظمیٰ ہماری مرہون منت ہے، اور دوسرا ماضی کے زخموں کو کرید کر نہ صرف بنگلہ دیش میں اسلامی رہنماؤں کی سزاؤں کی حمایت کرنا، بلکہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے درمیان ماضی کی تلخیوں کو ہوا دے کر فاصلے پیدا کرنا تھا۔

قیام پاکستان کے محض چالیس دن بعد ہی بھارت نے پاکستان کو جنگ کی پہلی دھمکی دی اوراس کے محض ایک ماہ بعد ہی بھارتی افواج ریاست جموں وکشمیر میں داخل ہوگئیں، اور ریاست جموں کشمیر کے 41342 مربع میل کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔کشمیر پر قبضے کے بعد بھارت نے مغربی پاکستان پر پہلا آبی حملہ یکم اپریل 1948ء کو کرتے ہوئے پانی روک لیا جو کہ مسلسل 34 دن تک بند رہا۔اس کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان میں سازشی سرگرمیوں کے لئے کلکتہ میں تحقیقی مراکز قائم کئے اور بنگالیوں میں احساس محرومی پیدا کرنے کے لئے گمراہ کن لٹریچر، کتابیں ،تصویریں تیار کر کے مشرقی پاکستان میں بھیجی جانے لگیں۔جس سے بنگالی نوجوانوں میں اس تاثر نے جنم لیا کہ جس آزادی کی خاطر انہوں نے قربانیاں دیں وہ مغربی پاکستان میں رہن ہوچکی ہے۔6 ستمبر 1965ء کو بھارت نے پاک افواج کے جذبوں اور قوت کا غلط اندازہ کرتے ہوئے اپنے سے دس گنا چھوٹے ملک (پاکستان) پر حملہ کردیا۔اس جنگ میں بھارت کو تاریخی ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور پاکستانی افواج نے اپنے عوام کے شانہ بشانہ بھارتی افواج کو ہر شعبہ میں شکست سے دوچار کیا۔1965ء کی شکست کا زخم چاٹتے بھارت کو اس بات کی بھی سمجھ آچکی تھی کہ پاکستان تر نوالہ نہیں کہ اسے فقط بیرونی جارحیت کے ذریعے ہڑپ کیا جاسکے، چنانچہ آئندہ جارحیت میں اپنے مذموم عزائم حاصل کرنے کے لئے بھارت نے برٹش انڈیا آرمی کی اسی پالیسی سے استفادہ کیا، جس سے شیر میسور ٹیپو سلطان کو زیر کیا گیا تھا، یعنی پاکستان کی صفوں میں میر جعفر تلاش کر کے انہیں اپنے ساتھ ملایا۔

1965ء کی جنگ میں پاکستان کو جنگی محاذوں پر تو کامیابیاں ملیں، تاہم مشرقی پاکستان میں کلکتہ سے آنیوالا گمراہ کن لٹریچر بنگالیوں کو عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا کر گیا، کیونکہ اس

جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کے اندر افواج پاکستان کی افرادی وفضائی قوت کم تھی۔اس کے علاوہ سرکاری زبان کے مسئلہ پر اور ایک سال قبل ہونے والے انتخابات کے نتائج کے باعث مشرقی پاکستان کے عوام تحفظات کا شکار بھی تھے۔ 2 جنوری 1964 کے صدارتی انتخابات منعقد ہوئے تو قائداعظم کی ہمشیرہ فاطمہ جناح نے ایوب خان کا مقابلہ کیا تھا۔حزب مخالف کی تمام جماعتوں نے ان کی حمایت کی تھی۔ بنگالیوں نے بھی ان کی حمایت میں غیر معمولی جوش وخروش کا مظاہرہ کیا تھا۔ان کے خیال میں ایک ڈکٹیٹر کو ہٹا کر سیاسی حقوق بحال کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا۔اگرچہ اس الیکشن میں ایوب خان نے بنیادی جمہوریتوں کے اسی ہزار ارکان کی اکثریت کے ووٹ حاصل کر لئے ،مگر ڈھاکہ میں ، جو مشرقی پاکستان کی سیاست کا مرکز سمجھا جاتا تھا، وہ مس جناح سے ہار گئے تھے۔ 5 فروری 1966 کو شیخ مجیب الرحمن نے لاہور میں اپنے مشہور چھ نکات کا اعلان کیا۔ چھ نکات میں بنیادی طور پر ایک ایسے سیاسی بندوبست کی وکالت کی گئی تھی جس میں مرکزی حکومت محصولات کے اختیارات کے بغیر امور خارجہ اور امور دفاع کی دیکھ بھال کرتی رہے۔مجیب نے اپنے پروگرام کو صوبائی خودمختاری کے حوالے سے پیش کیا، جبکہ مغربی پاکستان کے لوگوں نے اسے علیحدگی کی تحریک سمجھا۔ 20 جنوری 1968 اگرتلہ سازش کا انکشاف ہوا اور اس سازش میں شیخ مجیب الرحمن کے علاوہ 22 دوسرے بنگالیوں کو بھی اس الزام میں ماخوذ کیا گیا کہ وہ بھارت کی ملی بھگت سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ایک آزاد بنگال کے قیام کی کوشش کر رہے تھے۔

جولائی 1968 میں جب ڈھاکہ میں مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی تو بنگالیوں کا ردعمل قطعاً مختلف تھا۔حکومت کی جانب سے غدار قرار پانے والے مجیب کو بنگالی ہیرو قرار دے رہے تھے، بعدازاں اس مقدمے کے ایک ملزم کی ہلاکت پر مشرقی پاکستان میں حکومت مخالف مہم شروع ہوگئی۔بنیادی طور پر ایوب خان حکومت کے خلاف بنگالیوں کے احتجاج کو پاکستان کے خلاف مزاحمت کے طور پر لیا گیا۔دوسری جانب ڈھاکہ یونیورسٹی ہندو اساتذہ کی سرگرمیوں

کا مرکز بنی ہوئی تھی۔قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ہندو اساتذہ کی اکثریت تھی۔اگر چہ اس تناسب کو بدلنے کی ضرورت تھی،مگر حکومت کی جانب سے لاپروائی برتی گئی،جس کے نتیجے میں نوجوان افرادی قوت کی رگوں میں منفی پروپیگنڈہ رفتہ رفتہ انجیکٹ ہوتا رہا۔ساٹھ کے عشرے میں ہی بھارتی ریاستوں ناگالینڈ اور میزورم میں اٹھنے والی آزادی کی تحریکیں اگر چہ کامیابی سے تو ہمکنار نہیں ہوئیں،مگر ان تحریکوں کو لے کر پاکستان کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش کی گئی،اور اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان کو جدا کرنے کا تہیہ کیا،جس کے بعد را(RAW) کی سرگرمیاں مشرقی پاکستان میں بڑھ گئیں۔

مارچ 1969 فیلڈ مارشل ایوب خان نے لیڈروں سے مذاکرات کے لئے راولپنڈی میں ایک گول میز کانفرنس بلائی۔مقصد یہ تھا کہ مخالف جماعتوں کے بڑے بڑے مطالبات مان لینے سے گلی کوچوں میں بپھرے ہوئے لوگوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جائے۔مغربی پاکستان کے بعض رہنماؤں نے اس بات پر اصرار کیا کہ مجیب کو رہا کیا جائے تاکہ وہ جیل سے نکل کر ان مذاکرات میں شریک ہو سکے۔اس سیاسی دباؤ کے پیش نظر اگرتلہ سازش کا مقدمہ واپس لے لیا گیا۔مجیب نے 10 مارچ کو ڈھاکہ میں لوگوں کے ایک عظیم ہجوم سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ دونوں صوبوں میں مساوات (PARITY) کا اصول اب مشرقی پاکستان کے لئے ناقابل قبول ہے۔اب مشرقی پاکستان کو آبادی (55 فیصد) کے لحاظ سے نمائندگی ملنی چاہئے۔مجیب الرحمان ڈھاکہ میں یہ اعلان کر کے راولپنڈی آئے اور کانفرنس میں شریک ہوئے،مگر حکومت مخالف حالات نہ سنبھلے۔چنانچہ ایوب خان نے حکومت کی باگ ڈور فوج کے سربراہ جنرل آغا محمد یحییٰ خان کے سپرد کر دی۔یحییٰ خان نے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا۔ 28 نومبر 1969 کو جنرل یحییٰ خان نے ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول کو تسلیم کرلیا۔یہ اقدام مجیب کے حق میں تھا،مگر اس پر مغربی پاکستان کے لوگ ناخوش تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا کہ اس صورت میں بنگالیوں کو غلبہ حاصل ہو جائے گا۔

عام طور پر 1970 کے انتخابات کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی وجہ قرار دیا جاتا ہے، تاہم پہ آدھا سچ ہے۔ 12 نومبر 1970 کو مشرقی پاکستان، بھارت، مغربی بنگال میں انتہائی شدید نوعیت کا سیلاب آیا جس میں پانچ لاکھ اموات ہوئیں۔ لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔ متاثرین سیلاب کی امداد کے لئے پوری دنیا میں ایک مہم چلی۔ پاک فوج نے امدادی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تاہم مشرقی پاکستان میں اکثریتی جماعت نے امدادی کارروائیوں کو انتخابی مقاصد کے لئے پروپیگنڈے کے طور پر استعمال کیا۔ مشرقی پاکستان سے انتخابی امیدوار اپنے بیانات میں جہاں جہاں امدادی کارروائیوں کا ذکر کرتے، وہیں پاک فوج کی انتھک کاوشوں کو نظر انداز کر جاتے۔ مقصد مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والی جماعتوں سے ووٹرز کا رجوع توڑنا تھا۔ دنیا بھر سے آنے والی امداد اور اس کی تقسیم اور متاثرین سیلاب کے لئے جگہ جگہ ریلیف کیمپ قائم ہوئے۔ ان امدادی کیمپس میں بھارتی ایجنسی 'را' کو زیادہ کھل کر کھیلنے کا موقع ملا۔ امدادی سرگرمیوں میں رفتہ رفتہ کمی آنے کے بعد مشرقی پاکستان میں جگہ جگہ قائم یہی کیمپ بعد ازاں "مکتی باہنی" کے بیس کیمپ بنے۔ یہی کیمپ نہ صرف انتخابی عمل پہ اثر انداز ہوئے بلکہ مسلح کارروائیوں کے مراکز کے طور پر بھی استعمال ہوئے۔ سال بھر کی تیاری کے بعد انتخابات کے دوران ماسوائے جماعت اسلامی کے کسی سیاسی جماعت نے پورے پاکستان سے امیدوار کھڑے نہیں کئے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے صرف مغربی پاکستان میں الیکشن لڑا اور عوامی لیگ نے صرف مشرقی پاکستان کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ یہاں تک کہ مشرقی پاکستان میں جہاں سے جماعت اسلامی انتخابی عمل میں حصہ لے رہی تھی، اس کی راہ میں بھی طرح طرح کی رکاوٹیں حائل کی گئیں۔

انتخاب کے نتیجے میں عوامی لیگ سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی، اس کا موقف تھا کہ چونکہ سب سے زیادہ نشستیں اس کے پاس ہیں، لہٰذا اسے حکومت سازی کی دعوت دی جائے، جبکہ پاکستان پیپلز پارٹی کا موقف تھا کہ اس کی شمولیت کے بغیر حکومت نہیں بنائی جا سکتی

، لہٰذا حکومت کا حق اسے حاصل ہے۔ اصولی طور پر اس وقت کے صدر جنرل یحییٰ کو فیصلہ دینا تھا، مگر فیصلے میں تاخیر کے باعث، حالات بالخصوص مشرقی پاکستان میں، خراب ہوتے چلے گئے۔ دوسری جانب مشرقی پاکستان میں بھارتی خفیہ ادارے را (RAW) اور بی ایس ایف (BSF) کی کھلی مداخلت کے باعث مغربی پاکستان خصوصاً حکومت اور اس کے اداروں کے خلاف نفرت کی فضا بنائی جا چکی تھی۔ عام انتخابات کے بعد اقتدار کی منتقلی میں تاخیر خالصتاً پاکستان کا اندرونی معاملہ تھا لیکن بھارت نے اس میں کھلی مداخلت کی۔ 1970 کے انتخابات کے بعد حالات اس نہج تک پہنچ چکے تھے کہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کے لئے اکیلے باہر نکلنا مشکل ہو چکا تھا۔ سیاسی عدم استحکام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے را (RAW) اور بی ایس ایف (BSF) نے ان باغیوں کی تربیت شروع کر دی تھی، جنہوں نے بعد ازاں فوج کی وردیاں پہن کر عوامی مقامات پر حملے کئے۔ اس انتہائی خطرناک صورت حال میں شیخ مجیب الرحمن اور ذوالفقار علی بھٹو نے معاملات کو حل کی جانب لے جانے کی کوشش کرنے کے بجائے فقط اقتدار کی جنگ کو ہی ملحوظ خاطر رکھا۔

پانی سر تک آن پہنچا تو 25 مارچ 1971 کی شب مشرقی پاکستان میں آپریشن سرچ لائٹ شروع کیا گیا، کیونکہ پر تشدد واقعات کے بعد حکومت اور افواج پاکستان کے پاس کوئی دوسرا آپشن موجود نہیں تھا۔ آپریشن کو ناکام بنانے کے لئے بی ایس ایف سے تربیت حاصل کرنے والے باغیوں نے ایک جانب ظلم و تشدد کیا تو دوسری جانب پاک فوج کے خلاف نہایت منفی پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔ مشرقی پاکستان میں آپریشن سرچ لائٹ کا حکم لیفٹیننٹ جنرل صاحبزادہ یعقوب علی خان کو ملا تھا مگر وہ استعفیٰ دے کر واپس آ گئے تھے۔ ادھر شیخ مجیب الرحمان کو گرفتار کیا گیا تو جنرل عثمانی (اس وقت کے کرنل عثمانی) ڈھاکہ سے بھیس بدل کر سلہٹ پہنچے اور انہوں نے ایسٹ بنگال رائفلز کے افسروں کے ساتھ مل کر مسلح بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ 26 مارچ 1971ء کو پاکستانی فوج کے ایک باغی افسر میجر ضیاالرحمان نے آزاد مشرقی

پاکستان کا اعلان چٹاگانگ میں کیا۔جس کے اگلے ہی دن بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے میجر ضیاالرحمان کی قیادت میں بغاوت کرنے والوں سے تعاون کا اعلان کر دیا۔اپریل 1971 میں تاج الدین احمد بنگلہ دیش کی جلاوطن حکومت کے سربراہ بن گئے اور انہوں نے جنرل عثمانی کو مکتی باہنی کا کمانڈر انچیف بنایا۔مکتی باہنی کے کئی کمانڈرز ایسٹ بنگال رائفلز کے باغی افسران تھے،مگر ان میں کافی تعداد بھارتی فوجی افسران کی تھی۔تاہم بندوقوں کی دونوں جانب بظاہر پاک فوج کے جوان و افسران تھے۔

جب مکتی باہنی بھارت کی مدد کے باوجود بھی پاکستانی فوج کے مقابلے میں کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکی تو 21 نومبر 1971ء کو بھارت نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان میں داخل کر کے پوری قوت کے ساتھ حملہ کر دیا۔22 نومبر کو اندرا گاندھی نے جب اپنی فوج کو مشرقی پاکستان پر علی الاعلان حملہ کرنے کا حکم دیا تو اس وقت بھی وہ کلکتہ میں تھیں۔حملہ آور بھارتی فوج کی تعداد پانچ لاکھ تھی۔پاک فوج سے بھاگے ہوئے بنگالی جوان،افسر اور مکتی باہنی کے دستے اس کے علاوہ تھے۔پاک فوج کے مقابلے میں دشمن کی طاقت سات گنا زیادہ تھی۔سب سے بڑھ کر منفی پروپیگنڈے کے باعث مقامی آبادی کی مدد پاک فوج کو کم حاصل تھی۔چنانچہ 16 دسمبر 1971 کو پاک فوج کو ڈھاکہ ریس کورس میں ہتھیار ڈالنے پڑے۔جنرل نیازی نے جنرل اروڑا سنگھ کے سامنے ہتھیار ڈالے،اپنا سروس ریوالور جنرل اروڑا کے سپرد کیا۔ہتھیار ڈالے جانے کی دستاویز پر جنرل نیازی اور جنرل اروڑا کے دستخط تھے اور پاکستانی فوجیوں کو بھارتی سرزمین پر لے جا کر قیدی بنایا گیا تھا۔اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ درحقیقت بھارت کی بالادستی کی جنگ تھی جو اس نے پاکستان سے ناراض بنگالیوں کے کندھوں پر بندوق رکھ کر لڑی تھی۔
اندرا گاندھی کا خیال تھا کہ مشرق پاکستان پکے ہوئے پھل کی طرح بھارت کی جھولی میں آ گرے گا لیکن ایسا نہ ہوا اور مشرقی پاکستان کے لوگوں نے بھارت میں شامل ہونے کے بجائے بنگلہ دیش بنانا پسند کیا۔مکتی باہنی کے میجر ضیاالرحمان جب بنگلہ دیش کے صدر بنے تو وہ

بھارت کے بجائے پاکستان کے زیادہ قریب تھے۔ان کی بیوہ بیگم خالدہ ضیا کی جماعت بی این پی اوران کی اتحادی جماعت اسلامی کو پاکستان کا دوست سمجھا جاتا ہے جس پر بھارت میں یہ کہا جانے لگا کہ اندرا گاندھی نے ایک پاکستان کو ختم کرنے کی کوشش میں دو پاکستان بنا دیئے ہیں۔اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آج بھی بنگالی اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ تحریک پاکستان کا آغاز بنگال سے ہوا تھا۔

16 دسمبر 1971ء کو پاکستان دولخت ہوا، جس کی وجوہات میں سیاستدانوں کی حصول اقتدار کے لئے جنگ، ادھر ہم، ادھر تم کا نعرہ، دیرینہ دشمن کے مذموم عزائم سے مجرمانہ چشم پوشی، لوگوں میں احساس محرومی، دفاعی افرادی قوت کی کمی اور چانکیا پوری کا اکھنڈ بھارت کا جنون شامل تھے۔1971 کی جنگ میں پاک فوج کے مدمقابل 1965 کی طرح بھارتی فوج نہیں تھی، بلکہ اس کے اپنے تربیت یافتہ جنرل ، سپاہی اور ناراض ہم وطن شامل تھے۔اس جنگ میں وہ پاکستانی بھی شامل تھے جو"را"(RAW) سے تربیت حاصل کر چکے تھے۔وسیع پیمانے پر فوج کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کارفرما تھا، اور سب سے بڑھ کر سیاسی انتشار کا پورا پورا فائدہ بھارت نے حاصل کیا تھا۔فوجی اورسول انٹیلی جنس ایجنسیاں صدر کو رپورٹیں دے رہی تھیں کہ بھارت واضح طور پر مشرقی پاکستان میں مداخلت کررہا ہے۔صدر کو بتایا جاتا کہ بھارت ،مشرقی پاکستان میں خودارادیت کی تحریک کی براہِ راست مدد کررہا ہے۔ایک دوست ملک نے بھی انہیں اس قسم کی معلومات فراہم کیں۔جنرل یحییٰ خان نے ان الزامات کو سنجیدگی سے نہ لیا، لیکن جس وقت انہوں نے حقیقت کا ادراک کیا تو صورتِ حال قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ان کی کابینہ کے بہت سے ساتھیوں نے بھی پاکستان کو دوحصوں میں توڑنے کی بھارتی سازش کی عوامی جلسوں میں بات کی تھی اور عوام اورصدر کو متنبہ کیا تھا۔لیکن عوام نے بھی اور صدر نے بھی ان کے اس واویلے پر کان دھرنا مناسب خیال نہ کیا۔جس کے نتیجے میں وطن عزیز کے دو ٹکڑے ہوئے ،مگر بھارت بھی اکھنڈ بھارت کے خواب کے پہلے حصے کی تعبیر نہ پا سکا۔اکھنڈ بھارت کیا ہے،؟اکھنڈ بھارت

کے نظریے کو سمجھانے کے لئے حالیہ مودی سرکار نے بھارتی ریاست گجرات کے سرکاری اسکولوں کے نصاب میں صاف صاف یہ لکھوا دیا کہ اکھنڈ بھارت میں صرف بھارت نہیں بلکہ پاکستان، افغانستان، نیپال، بھوٹان، تبت، بنگلہ دیش، سری لنکا اور برما بھی شامل ہیں۔ اگر آج بھارتی فوجی برما کی سرحد کے اندر جا کر جارحانہ کارروائیاں کر رہے ہیں، یا افغانستان میں پاک سرحد کے قریب قونصل خانوں اور خفیہ اداروں کے مراکز کی زنجیر قائم کی گئی ہے، یا نیپال کے راستے بند کر کے بھارت اسے اپنے دباؤ میں رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، یا تبت کے اندرونی معاملات میں براہ راست مداخلت کر رہا ہے یا سری لنکا کو چین کے ساتھ شراکت داری کی جانب جانے سے روکا جا رہا ہے، تو اس کے پیچھے فقط اکھنڈ بھارت کا فلسفہ کارفرما ہے۔

1971 کی جنگ میں پاکستان کی شکست کے بعد اندرا گاندھی نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ بھارت نے دو قومی نظریے کو سمندر برد کر دیا ہے۔ چنانچہ ڈھاکہ یونیورسٹی میں مودی کا اقرار جرم اندرا گاندھی کے اسی بیان کا تسلسل ہے جس کا مقصد پرانے زخم کرید کر پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان تعلقات کی خلیج قائم کرنا ہے، حالانکہ قیام کے بعد ہی بنگلہ دیش کے رہنما بھی بھارت سے خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ بعد ازاں سارک کے قیام کا نظریہ بھی بنگلہ دیش نے ہی پیش کیا اور جب افغانستان پہ روس نے حملہ کیا تو اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کانفرنس کا عندیہ بھی بنگلہ دیش نے ہی دیا، جو پاکستان میں ہوئی تھی۔

سوال یہ ہے کہ ہم نے مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے سے کیا سبق حاصل کیا اور کیا بھارت نے ملکی باغی کے قیام اور اس کی پشت پناہی اور ہمسایہ ممالک میں اندرونی مداخلت کی روش چھوڑ دی؟ تو اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ آج بھی ٹی ٹی پی اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کی صورت میں ملکی باغی وطن عزیز میں سرگرم ہیں۔ جو 16 دسمبر کے زخم کو بار بار ہرا کر رہی ہیں۔ 1971 میں پاکستان کا ایک بازو جدا ہوا، تو 2014 میں پشاور کے آرمی پبلک سکول میں بچوں کے لہو کی ہولی کھیل کر کلیجے زخمی کئے گئے۔ ان ملکی باغیوں کے خلاف جب ضرب عضب کی صورت میں کارروائی جاری ہے تو اس سے توجہ ہٹانے کے لئے بھارت کی جانب سے سرحدی خلاف

ورزیوں کا سلسلہ جاری ہے ۔مشرقی پاکستان کی طرح آج بھی 'را' کراچی' فاٹا' بلوچستان میں سرگرم ہے ۔بھارت آج پاکستان دشمنی میں اس سے کہیں آگے نکل چکا ہے جہاں وہ قیام پاکستان کے وقت تھا، یا 1971 میں ۔1970ء کے انتخابات کے بعد پیدا ہونے والے سیاسی انتشار سے ہم نے یہی سبق حاصل کیا کہ 2013ء کے انتخابات کے بعد بھی سیاسی انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ۔اس وقت بھی نتائج کو تسلیم نہیں کیا گیا اور آج بھی نہ ماننے کا راگ الاپا جاتا ہے ۔اس وقت بھی اقتدار کی رسہ کشی جاری تھی تو آج بھی حصول اقتدار کی خاطر احتجاج کا سلسلہ جاری ہے ۔سیاستدانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہم نے ماضی سے یہی سیکھا ہے کہ ہم نے ماضی سے کچھ نہیں سیکھا۔تاہم 1971 میں مشرقی پاکستان کے اندر ہماری دفاعی قوت خاطر خواہ نہ تھی، جبکہ آج صورت حال اس کے برعکس ہے ۔اب پاکستان کے پاس اپنے تحفظ کے لئے وہ ہتھیار موجود ہیں، جن سے بھارت کا اپنا وجود خطرے میں پڑ سکتا ہے ۔

اس کے علاوہ آج بھارت میں اقلیتوں کے ساتھ جو سلوک کیا جارہا ہے وہ دوقومی نظریے کی تصدیق کرتا ہے ۔نریندر مودی کے متعلق یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ انتہاپسندی اور شدت پسندی سے بھارت کے سیکولر چہرے کو داغدار کررہے ہیں ، جبکہ میرے نزدیک نریندر مودی بھارتی پالیسیوں کا حقیقی چہرہ ہیں ۔ان کے خیالات ، اقدامات میں بھارتی پالیسی کا عکس جھلکتا ہے جس کا نمونہ گجرات کے فسادات ، گائے کی ذبیحہ پہ پابندی ، گوشت کھانے پہ پابندی ، ذبیحہ کے شک میں مسلمانوں کے قتل عام ،اقلیتی خواتین و بچیوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی کے واقعات ، اقلیتوں پر ریاستی جبر وتشدد ، سکھوں کی مقدس کتاب کی بے حرمتی ، حتیٰ کہ کھیل کے میدانوں کی ویرانی اور ان واقعات سے حکومتی چشم پوشی میں دکھائی دیتا ہے ۔اقلیتوں اور نچلے طبقے سے روا اس سلوک کے بعد اگر وہاں کے عوام یعنی سکھ، مسلمان بھی اپنے لئے الگ ریاستوں کا مطالبہ کریں تو ان کے اس اصولی مطالبے کو کب تک نظر انداز کیا جا سکے گا ۔؟

*****

آزادی۔ایک مسلسل سفر

محمود شام

...•••...

14اگست جب قریب آرہی ہوتی ہے تو ذہن کے پردے پر جانے کیا کیا مناظر ابھرنے لگتے ہیں۔مال گاڑی کا وہ کھلا ڈبہ تو مجھے بھولتا ہی نہیں۔حالانکہ پورے 70 سال گزر چکے ہیں۔نہ جانے کیسی کیسی قیامتیں برپا ہوچکیں۔کتنے سانحے رونما ہوچکے۔مہینہ اگست ہی کا تھا۔ہم انبالہ سے لاہور کے لئے روانہ ہوئے تھے۔انبالہ چھاؤنی میں تھے اس لئے سلامت بھی تھے۔ہمارے تایا کا پورا خاندان راجپورے میں تھا۔ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں تھی۔آج تک کوئی علم نہ ہوسکا۔اس ڈبے کی چھت نہیں تھی لیکن اس وقت ہمارے لئے یہ جنت سے کم نہیں تھا کیونکہ یہ ہمیں غلامی سے آزادی کی طرف لارہا تھا۔یہ ہمیں اندھیروں سے اجالوں میں لارہا تھا۔دھوپ بڑی کڑی تھی مگر مجھے اپنی ماں کی آغوش میسر تھی'اس کے آنچل نے سورج کی تپش روک رکھی تھی۔میرے عظیم والد حکیم صوفی شیر محمد ہمارا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔میری عمر پانچ سال تھی۔میرے بڑے بھائی ڈاکٹر خالد مسعود مجھ سے دو سال بڑے تھے۔یہ تھا کل کنبہ اس وقت۔باہر سے نعروں کی خوفناک آوازیں سنائی دیتیں تو ہماری ماں دونوں بھائیوں کو آغوش میں سمیٹ لیتی،اباجی اور دوسرے مرد چوکنے ہوکر نگاہیں باہر جمالیتے۔

آج جب میڈیا پر سیاسی حلقوں میں بحثیں چھڑتی ہیں پاکستان کیوں بنا تھا۔نظریہ پاکستان کیا تھا۔پاکستان ناکام ریاست ہے یا ناکام ہوتی ہوئی۔کچھ لوگوں کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر یاد آتی ہے۔ایسے میں میرے سامنے تو مال گاڑی کا کھلا ڈبہ اور اگست کی چلچلاتی دھوپ آجاتی ہے۔میرے لئے تو پاکستان کا نظریہ یہی جذبہ ہے جو ہمیں اس نئے ملک کی طرف لارہا

تھا۔ ہر چند ٹرانسپورٹ دستیاب نہیں تھی۔حالات انتہائی مخدوش تھے۔جو راہ اِدھر کو جاتی تھی مقتل سے گزر کر جاتی تھی۔آگ اور خون کے دریاؤں میں اتر کر جانا تھا لیکن منزل متعین تھی اور یہی منزل اس وقت واحد مقصود تھا' قیادت پر کامل یقین تھا' اعتماد پختہ تھا کہ یہ قائد ہی ہمیں آگے لے کر جاسکتا ہے۔یہی صراطِ مستقیم ہے۔یہ لیڈر شپ ہی وقت کے تمام نشیب و فراز سمجھتی ہے۔خطے کے رموز جانتی ہے۔عالمی سیاست کی پیچیدگیوں پر نظر رکھتی ہے' اس لئے ہم اور ہمارا مستقبل اس کے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔یہ تھا میرا اور مجھ جیسے کروڑوں کا نظریہ پاکستان۔کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا کہ پاکستان کی اساس اسلام ہے۔اسلام تو پوری دنیا کی تخلیق کی اساس ہے۔پاکستان دنیا کے ایک مخصوص علاقے میں وجود پا رہا تھا۔پہلے سے کئی اسلامی ملک کائنات میں قائم تھے اور صدیوں سے تھے۔ان میں وہ ممالک بھی تھے جن کے ذریعے ہم تک اسلام کی عظیم تعلیمات کی روشنی پہنچی۔جنہوں نے باقاعدہ جدو جہد کی' اسلام کے لئے قربانیاں دیں۔وہ پہلے سے اسلام کے قلعے تھے۔

میں صرف پانچ سال کا بچہ تھا لیکن اس نئی اور اجنبی سرزمین پر آ کر مکمل اپنائیت محسوس کر رہا تھا۔گلیاں مختلف تھیں' سڑکیں اجنبی لیکن دل کہہ رہا تھا یہی تو میرے خوابوں کی تعبیر ہے۔چہرے نئے تھے لیکن آنکھوں میں چمک اپنوں جیسی تھی۔باہیں کھلی تھیں۔ہر طرف پیار ہی پیار تھا۔گھروں کے دروازے وا تھے۔دستک کی ضرورت نہیں تھی۔ہم بے گھر تھے' بے نام تھے' لیکن مقامی لوگ ہمیں یہ احساس نہیں ہونے دے رہے تھے۔ہم بے زر تھے لیکن ہمیں کچھ خریدنے کی مجبوری نہیں تھی۔ہر چیز ہمارے میزبان ہمیں لا کر دے رہے تھے۔یہ تھا نظریہ پاکستان۔

ہمارے بزرگ اس یقین سے سرشار تھے کہ ہمیں اس نئے وطن میں اپنا رزق اطمینان سے اپنے زورِ بازو سے حاصل کرنے کا موقع ملے گا۔ہمیں اپنی عبادتیں سکون سے کرنے کی آزادی ہوگی۔مجھے یاد ہے کہ ہمارے ہی مسلمان بھائی' بعض جید علماء' قیام پاکستان کے مخالف تھے۔

ان کا اپنا استدلال تھا۔ان میں سے بعض نے تو باقاعدہ تحریکِ پاکستان کے خلاف شدومد سے کام بھی کیا۔مسلم لیگ کی قیادت پر الزامات بھی عائد کئے۔لیکن جب قائداعظم کی حقیقت پسندانہ قیادت میں اور برصغیر کے مسلمانوں کی دلیرانہ جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان کی جنت حاصل ہو گئی تو قیام پاکستان کے مخالفین میں سے ایک بڑی تعداد نے تو اسے ایک حقیقت مانتے ہوئے اس کی ترقی اور استحکام کی کوششوں میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا مگر ایک حلقہ ایسا تھا جس نے اس تاریخی کامیابی کو اپنی شکست سمجھا اور وہ پاکستان کے خلاف سازشوں میں مصروف ہو گئے۔انہوں نے مختلف قسم کی غلط فہمیاں پھیلانا اپنا شعار بنا لیا۔فریب' دھوکے سے لوگوں کو گمراہ کیا۔حد تو یہ کہ اس بدنیتی میں مذہب کے مقدس نام کا بے دریغ استعمال کیا۔پہلے پاکستان کے خلاف ان کی دلیل تھی کہ مذہب کی بنیاد پر ملک قائم نہیں ہوسکتے۔اب پاکستان بننے کے بعد ان کا استدلال اس کے قطعی برعکس تھا کہ پاکستان کو مذہبی ریاست بنایا جائے۔کبھی کہا گیا کہ شریعت اساسی قانون ہونا چاہئے۔کبھی کہا گیا کہ یہاں خلافت قائم کی جائے۔پھر فرقہ واریت کو ہوا دی گئی۔پاکستان جب وجود میں آیا۔اس وقت غور سے مطالعہ کریں تو فرقوں کے حوالے سے اتنی شدت دکھائی نہیں دیتی۔سب آپس میں شیر وشکر نظر آتے ہیں۔سنجیدگی سے تحقیق کی جائے تو کھل کر یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ فرقہ پرستی کو انتہائی منظم انداز میں آگے بڑھایا گیا اور اسے زندگی موت کا مسئلہ بنا دیا گیا۔مسلمانوں کے اتحاد کو بتدریج پارہ پارہ کیا گیا۔تمام مسلم ممالک پر نظر ڈالیں' ان کی تاریخ پڑھیں' کہیں بھی اس شدت کی فرقہ پرستی نہیں ملتی ہے۔اسی فرقہ وارانہ تقسیم نے ملک میں انتہاپسندی کی بنیاد ڈالی۔

نئی نسل نے یہ سب کچھ خوفناک شکل میں پھلتے پھولتے دیکھا ہے اور بہت دکھ اور کرب محسوس کیا ہے۔پیار اور سلامتی کے مذہب کو تصادم اور نفرت کی علامت بنا دیا گیا۔کوئی بھی دردمند اگر پاکستان کے حالات کا سنجیدگی اور غیر جذباتی رویئے سے مشاہدہ اور تجزیہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہوسکتی ہے کہ پاکستان کو ترقی کے راستے پر آگے بڑھنے سے روکنے

میں، مسلسل سیاسی بحران پیدا کرنے میں، کبھی اقتصادی پیشرفت جاری نہ رہنے دینے میں اور تواتر سے مذہب کے حوالے سے'یا' دین کی بنیاد پر تنازعات کھڑے کرنے کے پس منظر میں' یہی قیامِ پاکستان کی مخالف قوتیں دریافت ہوں گی۔ تاریخ اسلام میں بھی اسلامی حکومتوں اور اسلامی لشکروں کو انہی قوتوں نے زیادہ نقصان پہنچایا جنہوں نے بظاہر زاہدوں، صالحین اور مفتیوں کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ میری گزارش یہی ہے کہ جس طرح قیام پاکستان کے ان اندرونی اور بیرونی مخالفین نے اپنے بنیادی کردار اور مؤقف کو نہیں بدلا ہے بلکہ ان کے اپنے بقول وہ اپنے اکابرین کے مسلک اور رائے کو صائب کرنے کے لئے پاکستان کو کمزور کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اس کے لئے وہ ہمیشہ مذہب کو استعمال کرتے ہیں' اور اپنی ان کوششوں کو ایک تحریک کے طور پر جاری رکھتے ہیں۔ ہم' جن کے بزرگوں نے پاکستان کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' جانوں کی قربانیاں دیں' جو قیام پاکستان کو اس وقت بھی ناگزیر سمجھتے تھے اور ہندوستان میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کا حل ایک علیحدہ ملک کی صورت میں ہی خیال کرتے تھے۔ آج بھی جو پاکستان کی کامیابی اس کے سیاسی' اقتصادی اور سماجی استحکام میں سمجھتے ہیں ان کو بھی اسی شدت سے قیام پاکستان کے مخالفین کا مقابلہ کرنا ہوگا' جس طرح قائداعظمؒ کی قیادت میں ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں کا کیا تھا اور ان کو آخر کار شکست دینے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ جس طرح اس وقت ہمارے سامنے ایک واضح منزل' ایک الگ ملک کا حصول تھا' ایک روڈ میپ موجود تھا۔ اسی طرح اب بھی ہمیں ایک واضح منزل کا تعین کرنا ہے' پھر اس کے حصول کے لئے ایک روڈ میپ تیار کرنا ہے۔ اس روڈ میپ پر مرحلہ وار عمل کرنے کے لئے پھر ایک تحریک چلانا ہوگی پھر 23 مارچ اور 14 اگست کا جذبہ اور ولولہ درکار ہوگا۔

آج ہم ایک ایٹمی ملک بن چکے ہیں۔ کوئی اور اسلامی ملک یہ صلاحیت حاصل نہیں کر سکا۔ عسکری اعتبار سے ہم ایک طاقت ہیں۔ جائزہ لیں تو ہمارے حق میں زیادہ نکات ملیں گے۔ یہ درست ہے کہ اپنی ملی کوتاہیوں کے سبب ہم زوال کا شکار بھی رہے ہیں' ہمارے حکمرانوں نے

صحیح وقت پر صحیح فیصلے نہیں کئے بہت سے حاکموں نے ملک کو بے دریغ لوٹا ہے' ایک قوم کی حیثیت سے ہم آگے نہیں بڑھ سکے' ہم پنجابی ہیں' سندھی ہیں' پشتون ہیں' بلوچ ہیں' مہاجر ہیں' کشمیری ہیں' ہم سنی ہیں' شیعہ ہیں' وہابی ہیں' بریلوی ہیں' حنفی ہیں' نہیں ہیں تو پاکستانی نہیں ہیں۔ اس کی بھی ٹھوس وجوہ ہیں۔جب میرٹ پر آگے بڑھنے کا رجحان ختم کر دیا گیا اور اپنے مسائل کے حل اور روزگار کے حصول کے لئے مخصوص علاقوں سے یا فرقوں سے منسوب ہونے سے ہی آسانی ہونی تھی تو مسلمان اور پاکستانی ہونے کا اعلان بے مقصد تھا۔یہ انتہائی المناک اور تلخ حقیقت ہے۔

اس مملکت کی حدود میں رہنے والے ہر فرد کو یہ فخر ہونا چاہئے کہ ہم اس عظیم ملک پاکستان کے شہری ہیں' جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن جہاں دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی رہتے ہیں جن میں ہندو' سکھ' عیسائی' پارسی سب ہی شامل ہیں۔انسانی اور معاشی حقوق کے حوالے سے یہ بھی برابر کے شہری ہیں۔ہمیں بجا طور پر یہ اعتماد بھی ہونا چاہئے کہ پاکستان کو قدرت نے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔یہاں سونا بھی ہے' تانبا بھی' گیس بھی اور تیل بھی۔ہمارے پاس کئی میل طویل قدرتی ساحل بھی ہے۔جفا کش' باہمت' محنت' مشقت سے کبھی نہ گھبرانے والے کروڑوں پاکستانی بھی۔جن کی صلاحیتوں' توانائیوں کا اعتراف غیر ممالک بھی کرتے ہیں۔دو بے مثال طاقتیں اور ہیں جو دنیا میں بہت کم ملکوں کو نصیب ہوتی ہیں' وہ ہے ہمارا انتہائی اہم محل وقوع' یعنی جغرافیائی حیثیت۔ہماری یہ حسین مملکت ایک ایسے نا کے پر موجود ہے کہ ادھر جنوبی ایشیا والوں کو اگر مشرق وسطی میں جانا ہو یا مڈل ایسٹ والوں کو جنوبی ایشیا سے معاملہ کرنا ہو' چین کو وسطی ایشیائی ملکوں سے تجارت کرنا ہو' یورپ والوں کو مشرق بعید سے رشتے استوار کرنا ہوں' تو ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے پاکستان۔بدقسمتی سے اس اہم محل وقوع کو اپنے سیاسی اور اقتصادی مفاد میں استعمال کرنے کی بجائے ہم شدت پسندی اور دہشت گردی میں الجھ کر اس جغرافیائی پوزیشن کو اپنے لئے ایک مصیبت بنا بیٹھے ہیں۔

اسی طرح اپنی ایک اور خدا داد طاقت کو بھی اپنی کوتاہیوں اور بے عملیوں سے اپنے لئے منفی بنا بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔اور وہ ہے ہماری نوجوان نسل۔ہمیں قدرت نے 62 فی صد آبادی پندرہ سے پینتیس سال کے درمیان دی ہے۔اس وقت ترقی یافتہ قومیں بڑھتی ہوئی عمر کے مسئلے سے دوچار ہیں۔بچے پیدا کرنے پر پابندیاں ہیں یا ان معاشروں میں شادیاں کرنے کا رواج ختم ہو رہا ہے۔دوسری طرف علاج معالجے کی سہولتوں' اچھی خالص خوراک ملنے اور زندگی کی دوسری آسانیاں فراہم ہونے سے انسان زیادہ برس زندہ رہنے لگے ہیں مگر عمر رسیدہ ہونے سے ان کے جسم کام کرنے کے لائق نہیں رہتے' انھیں جواں سال افرادی قوت کی ضرورت رہتی ہے۔ پاکستان میں آبادی کا زیادہ حصہ نوجوان ہے۔توانائیوں سے بھرپور پُرعزم' باہمت' یہ بہت ہی مثبت پہلو ہے۔ہمارے پاس معدنی قوت بھی ہے جس میں سب سے نمایاں ریکوڈک ہے۔ سونے کا کئی سال تک ختم نہ ہونے والا خزانہ۔جس کی مالیت اربوں ڈالر بتائی جارہی ہے۔ ہماری زمینیں جو دنیا بھر کے لئے ضرورت کی ہر جنس پیدا کرسکتی ہیں۔ہمارے ساحل جہاں بہت گہری سمندری بندرگاہیں بن سکتی ہیں، گوادر ایسی ہی ایک اہم بندرگاہ ہے' ہمارے پاس افرادی قوت ہے' ہمارے پاس جغرافیائی قوت ہے' ہم ایٹمی طاقت ہیں' ہم اپنی تمام حماقتوں، کوتاہیوں' سانحوں، غلطیوں اور ناکامیوں کے باوجود 1947 کی نسبت کہیں بہتر پوزیشن میں ہیں۔ہمارے وسائل پہلے سے زیادہ ہیں۔ہم اس وقت کی طرح دور دور بکھرے ہوئے نہیں ہیں۔ہماری مسلح افواج اس وقت کی نسبت کہیں زیادہ منظم، کہیں زیادہ تربیت یافتہ' ہمارے شہری پہلے سے زیادہ تعلیم حاصل کئے ہوئے۔ہمارے ہاں پہلے سے کہیں زیادہ یونیورسٹیاں' تربیتی ادارے' بنک' مالیاتی ادارے بھی کہیں زیادہ۔اب اگر ہم کوئی تحریک چلائیں گے تو اسے 1947 کے مقابلے میں بہت سی اضافی قوتیں میسر آئیں گی جن میں ٹیکنالوجی سرفہرست ہے۔تحریک پاکستان کے اکابرین سے دریافت کیجئے انھیں اپنے پیغامات پہنچانے میں کتنی دشواریاں ہوتی تھیں۔انٹرنیٹ تھا نہ موبائل فون' ای میل' نہ فیکس۔چند اخبار

تھے۔ چینلوں کا کوئی تصور بھی نہ تھا۔ اب غور کریں اپنا پیغام آپ پلک جھپکنے میں ملک ہی نہیں دنیا بھر میں پہنچا سکتے ہیں۔ مگر یہ تیز رفتار ترسیلی نظام، یہ سرعت پذیر ٹیکنالوجی، وہ جذبہ نہیں دے سکتی جو 1940 کے عشرے میں تھا۔ یہ ہمیں اپنی پرانی نسلوں سے ہی حاصل کرنا ہوگا۔ سوچئے اگر وہ جذبہ اور آج کی ٹیکنالوجی یکجا ہو جائیں۔ آپ کے دل اور ذہن تحریک پاکستان کے سچے جذبے سے سرشار ہوں انگلیاں کمپیوٹر پر، موبائل ہاتھ میں، چینلوں سے پیغام ہر پل کروڑوں دلوں میں اتر رہا ہو، وہ اس پر عمل بھی کر رہے ہوں تو پاکستان کتنی جلدی بدل سکتا ہے۔ پستیوں کی طرف سفر کتنی تیزی سے رک سکتا ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ اب پیغام کیا ہو سکتا ہے؟

اب تحریک کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟

اب ہماری منزل کیا ہونی چاہئے؟

اب لوگ باہر کیوں آئیں؟

اس وقت قیام پاکستان ایک عظیم مقصد تھا اب کیا ہے؟

یہ سب سوالات انتہائی بجا اور بر وقت ہیں۔

1947 میں قیام پاکستان مقصد تھا منزل تھی، اب استحکام پاکستان منزل ہونی چاہئے، ہر شعبے کے ماہرین کو یہ حساب لگانا ہوگا کہ 70 سال بعد کیا پاکستان ان کے شعبے میں وہاں ہے، جہاں اسے اتنے برس بعد ہونا چاہئے تھا۔ ہمارے آس پاس کے ملک کہاں پہنچے ہیں۔ ہمارے ساتھ آزاد ہونے والے ممالک میں شہریوں کو کیا کیا سہولتیں میسر ہیں آج کی ترقی اور استحکام کا اندازہ انسانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ملنے والی آسانیوں سے کیا جاتا ہے۔ روزگار کے مواقع سے کسی ملک کی خوشحالی واضح ہوتی ہے۔ ملک میں لوگوں کی جان اور مال کے تحفظ سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کتنا آگے بڑھا ہے۔

اب جو تحریک چلنی چاہئے اس کا مقصد ایک محفوظ، خوشحال، خود کفیل پاکستان کا حصول ہو

سکتا ہے جو علامہ اقبالؒ کا خواب بھی تھا اور قائداعظمؒ کا تصور بھی۔

پاکستان واحد اسلامی ملک تو نہیں ہے لیکن واحد ایٹمی مسلم ملک تو ہے' اس طرح عسکری معنوں میں یہ اسلام کا قلعہ ہے۔ فوجی طاقت کے ساتھ ساتھ آج کل کی دنیا میں ایک ملک کو معاشی طاقت بھی ہونا چاہئے۔ اسے تعلیم' تہذیب' ثقافت سے مالامال بھی ہونا چاہئے۔ اسے اپنے معدنی قدرتی وسائل کو بھرپور انداز میں استعمال کرکے معاشی آزادی بھی حاصل کرنی چاہئے۔ یہ ہماری منزل ہو سکتی ہے۔

اس تک پہنچنے کے لئے ہمیں ایک روڈ میپ تیار کرنا ہے۔ یہ ہماری اپنی ذمہ داری ہے۔ ہمیں خبردار رہنا ہوگا کہ اگر آگے بڑھنے کے لئے اپنا لائحہ عمل ہم خود طے نہیں کریں گے تو یہ کام کوئی اور کرے گا اور وہ اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے کرے گا۔ دنیا آگے جا رہی ہے۔ آج کی دنیا میں کوئی ملک الگ تھلگ یا کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ ہم ایک تیزی سے بھاگتی دوڑتی کائنات کا حصہ ہیں۔ ہمارے بے عمل رہنے سے یا سست رفتاری سے دنیا کا سفر رکے گا نہیں۔ ہم پر کھوئے گئے لمحوں کا بوجھ زیادہ ہوتا جائے گا۔ ہمیں خود یہ طے کرنا ہے کہ ہم پاکستان کو کیا سمت دینا چاہتے ہیں' کیسا معاشرہ بنانا چاہتے ہیں۔

پاکستان کی مسلح افواج نے ضرب عضب کے ذریعے قوم کو ایک واضح سمت دے دی ہے کہ اس ملک میں انتہا پسندی اور اپنی مرضی کی شریعت مسلط کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ وہ اپنی جانوں کی قربانیاں دے کر ایک کھلا پیغام دے رہے ہیں کہ اس ملک کو آگے بڑھنا ہے ماضی کے اندھیروں میں گم نہیں ہونا ہے۔ ہم سب کو 14 اگست کی صبح یہ سوچنا ہوگا' اپنے بچوں اور بزرگوں کو پاس بٹھا کر یہ تبادلہ خیال کرنا ہوگا کہ اس وقت پاکستان کا روڈ میپ کیا ہونا چاہئے۔ آج سے لے کر آئندہ 10 سے 15 برس میں دنیا کیا کیا منزلیں حاصل کر لے گی۔ دوسری قومیں کون کون سے آفاق تسخیر کر لیں گی' اپنے شہریوں کی سہولتوں میں مزید کیا کیا اضافے کر چکی ہوں گی ہم اگر ان کے برابر نہیں رہ سکتے تو فاصلے کچھ کم تو کر سکتے ہیں۔ ہماری نظر مستقبل پر

ہونی چاہیئے ۔اپنے وسائل پر اعتماد اپنی ذات پر بھروسہ اور اپنے پروردگار پر یقین ہونا چاہیئے ۔

کسی شک یا گمان کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے پاکستان ناگزیر تھا۔تاریخ کا تقاضا تھا۔ جغرافیے کی مجبوری تھی اورعوام کا فیصلہ تھا۔اب پاکستان کا استحکام ناگزیر ہے اوراس کے لئے ہمیں سب کی رائے سے روڈ میپ بنانا ہے ۔

اس روڈ میپ کو صرف سیاست دانوں پر نہیں چھوڑنا ہے ۔ ماہرین تعلیم، دانشور، علماء، ٹیکنوکریٹ، مصور، مصنف، مسلح افواج سب منتخب ارکان کا ساتھ دیں ۔

ایک بار پھر تحریک پاکستان چلے
ایک بار پھر جدو جہد کی مشعل جلے

جذباتیت نہیں حقائق کا سہارا اور صرف اپنے وسائل پر انحصار ۔

ایک صبح حسیں ہماری منتظر ہے ۔جو دوسری قومیں کرسکتی ہیں ہم پاکستانی بھی کرسکتے ہیں ۔

*****

پاکستان۔۔۔زندہ باد

سید انصار ناصری

...•••...

سید انصار ناصری حصولِ پاکستان کے آخری باب کے چشم دید گواہ ہیں۔ 3 جون 1947ء سے لے کر 15 اگست 1947ء تک کے واقعات کو انہوں نے لمحہ لمحہ دیکھا اور دھڑکن دھڑکن لکھا۔ 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے استعمار کے آخری نمائندے کی حیثیت سے برصغیر کی تقسیم کا اعلان کیا۔ وائسرائے کی تقریر کے بعد کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لعل نہرو، مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے سربراہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ اور سکھوں کے رہنما سردار بلدیو سنگھ نے اپنی اپنی سیاسی حیثیت میں اس منصوبے کے حوالے سے اظہار خیال کیا۔ 3 جون ہماری جدّوجُہد آزادی کا آخری سنگ میل ہے۔ اس کے 72 روز بعد 14 اگست 1947ء کو آزادی کا سورج اپنی تمام تر تابانیوں کے ساتھ روشن تھا۔ سیّد انصار ناصری اس 72 روزہ سفر کے مبصر ہی نہیں مفسر بھی ہیں۔ وہ 3 جون 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی میں سینئر پروگرام ایگزیکٹو تعینات تھے۔ انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ قائداعظمؒ کی تقریر کا انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا اور پھر یہ ترجمہ ان ہی کی آواز میں قائد اعظمؒ کی تقریر کے فوراً بعد نشر کیا گیا۔ قائداعظمؒ کی یہ پہلی تقریر تھی جس کا اختتام انہوں نے "پاکستان زندہ باد" کے نعرے سے کیا کہ اب یہ نعرہ ایک حقیقت بن چکا تھا۔ سیّد انصار ناصری نے نعرے سے حقیقت کا یہ سفر اپنی یاداشتوں اور تاریخی دستاویزات میں سمو کر بڑے دل آویز انداز میں اپنی کتاب "پاکستان زندہ باد" میں محفوظ کر دیا۔

1947ء کے جون کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ دلی کی گرمیاں اپنے شباب کو پہنچ گئی تھیں اور اُدھر دلی میں مسلمانوں کی سیاسی سرگرمیاں بھی عروج کی انتہائی بلندیوں کو چھو رہی تھیں۔

پچھلے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں کانگریس کے مقابلے

میں زبردست اکثریت کے ساتھ کامیابی حاصل ہوئی تھی۔اس کے فوراً بعد قائداعظمؒ نے تمام منتخب ممبرانِ اسمبلی کا کنونشن دلی میں طلب کیا تھا جس میں ہندوستان کے گوشے گوشے سے تقریباً پانچ سو مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی نے شرکت کی تھی۔اتنی کثیر تعداد میں مسلم لیگی لیڈروں کے بیک وقت تشریف لانے سے دلی شہر میں بڑی گہما گہمی ہوگئی تھی۔

اسی کنونشن میں قائدِ اعظمؒ کے صدارتی خطبے کے بعد بنگال کے وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی صاحب نے اپنی وہ یادگار قرارداد پیش کی تھی جس کے ذریعے بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد وخود مختار مملکت پاکستان کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا اور کانگریس کے ''متحدہ ہندوستان'' کے ڈھونگ کو دوٹوک انداز میں ہمیشہ کے لئے مسترد کردیا گیا تھا۔ جملہ مسلم لیگی ممبرانِ اسمبلی نے جن میں اقلیتی صوبوں کے ممبران پیش پیش تھے، سہروردی صاحب کے پیش کردہ اس قرارداد کی بھرپور تائید کرتے ہوئے اسے متفقہ طور پر منظور کرلیا اور صرف زبانی طور پر منظور ہی نہیں کیا بلکہ قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے ہر ایک ممبر نے تحریری حلف نامے پر دستخط کرکے یہ قسم بھی کھائی کہ:

''...میں مطالبۂ پاکستان کی دل و جان سے حمایت کرتا/کرتی ہوں۔میرا ایمان ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی فلاح و بہبود حصولِ پاکستان پر ہی منحصر ہے، اس لئے میں صمیمِ قلب سے عہد کرتا ہوں کہ پاکستان کے حصول کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کی ہر ایک ہدایت پر خلوصِ نیت سے عمل کرتا رہوں گا اور اس سلسلے میں جو بھی مالی اور جسمانی قربانیاں مجھے دینا پڑیں گی، ان سے کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔''

اس اعتبار سے دلی میں منعقد ہونے والا مسلم لیگ کا یہ کنونشن لاہور کے جلسے میں منظور کی جانے والی ''قراردادِ پاکستان'' کی عملی تکمیل کی جانب نہایت اہم پیش رفت ثابت ہوا۔دلی شہر جو ہمیشہ سے دارالسلطنت ہونے کے باعث حکومت اور اقتدار کا مرکز رہا تھا، حصولِ پاکستان کی آئینی اور قانونی جنگ کا زبردست محاذ بن گیا تھا۔کانگریسی ہائی کمان میں ہلچل مچی ہوئی تھی،

خاص طور پر جب سے مسلم لیگ نے ہندوستان کی عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کی تھی اور لیاقت علی خان نے بحیثیت وزیرخزانہ اپنا وہ یادگار بجٹ پیش کیا تھا جو ''غریبوں کا بجٹ'' کہلاتا تھا، اس کی رُو سے اُن بڑے بڑے ساہوکاروں اور مہاجنوں پر بھاری ٹیکس عائد کئے گئے تھے جو کانگریس کو تھیلیاں بھر بھر کے مالی امداد دیتے تھے۔ جب ان ساہوکاروں کو قانوناً بھاری ٹیکس ادا کرنا پڑے تو ان میں سے اکثر نے کانگریس کو مزید رقمیں فراہم کرنا بند کر دیں۔ اس سے کانگریس کی صفوں میں ہر طرف سے ''ہاہا کار'' مچ گئی۔ ہندو اخباروں میں لمبی لمبی اپیلیں شائع ہوتی رہیں لیکن بے سود۔ کانگریسی بے بس ہو کر رہ گئے۔۔۔ کانگریس ہائی کمان کے بڑے لیڈر علی الاعلان کہتے پھرتے تھے کہ ''یہ مُسلے (مسلمان) کبھی ساتھ نہیں مل سکتے۔ ان کو بھارت دیس سے نکال کر ہندوؤں سے الگ کر دینا ہی مسئلے کا حل ہے۔'' ان کے دل کی بات آخر ان کی زبان پر آ ہی گئی۔ یہی تو وہ ہزاروں باتوں کی ایک سچی بات تھی جو سرسیدؒ سے لے کر قائداعظمؒ تک سب حق گو مسلمان لیڈر بار بار کہتے آئے تھے کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں جن کا دین، تمدن و معاشرت، اخلاقی اقدار، خوراک و لباس، زبان، انداز فکر و نظر، تصور حیات تک ہندوؤں سے یکسر مختلف بلکہ متضاد ہیں۔ مسلم قوم کبھی ہندو قوم میں مدغم نہیں ہو سکتی۔ ان ہی حقائق کی بنا پر مسلمان اپنے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ بالآخر یہی حقیقت نظریۂ پاکستان کی اٹل اور انمٹ بنیاد بنی۔

جوں جوں ہندوؤں کی مسلمانوں کے خلاف منافرت اور آئے دن کی چپقلش، جھگڑے اور فسادات بڑھتے گئے، اس سے دگنی نسبت سے مسلمانوں کا باہمی اتحاد بڑھتا گیا۔ شیعہ، سنی، وہابی، اہل حدیث، بریلوی، دیوبندی سب یکجان و ہم آواز ہو گئے تھے۔ سیاسی شعور بھی اس قدر تقویت پا گیا تھا کہ سوائے چند علماء کے سب کی زبان پر کلمہ کے ساتھ ایک ہی آواز تھی ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔''

قائداعظمؒ پچھلے کئی مہینوں سے اپنی رہائش گاہ نمبر 10 اورنگ زیب سٹریٹ بمبئی میں

رہائش پذیر تھے۔مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اراکین اور دیگر متعدد زعما بھی دہلی ہی میں مقیم تھے۔ نواب زادہ لیاقت علی خانؒ جنرل سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ بھی اپنی ذاتی کوٹھی"گلِ رعنا" ہارڈنگ ایونیو میں متمکن تھے۔خواجہ ناظم الدینؒ،سردار عبدالرب نشترؒ،نواب صدیق علی خانؒ بھی اکثر ان ہی کے مہمان رہتے تھے۔رات دن اہم اجلاس ہوتے تھے۔بڑے اجلاس مسلمانوں کی قدیمی درسگاہ اینگلوعربیک کالج دہلی میں منعقد ہوتے تھے جن میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے اور قائدِ اعظمؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا ظفر احمد عثمانیؒ،مفتی شفیعؒ، مولانا مظہر الدینؒ (ایڈیٹر الامان) کے پُرجوش اور ولولہ انگیز خطابات سُن سُن کر حصولِ پاکستان کے لئے اپنی جان قربان کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتے۔محلے محلے مسلم لیگ نیشنل گارڈز اور رضا کاروں کی تنظیمیں قائم ہوچکی تھیں۔شہر کے چوکوں اور بازاروں میں نوجوانوں کے جتھے کے جتھے رات گئے تک پریڈیں کرتے اور نعرے لگاتے پھرتے:

"نعرہ تکبیر---اللہ اکبر!"

"نعرہ حیدری---یاعلیؓ!!"

"قائدِ اعظمؒ---زندہ باد!"

"پاکستان---زندہ باد!"

پاکستان کا مطلب کیا---لاالٰہ الا اللہ!!

"بٹ کے رہے گا ہندوستان

لے کے رہیں گے پاکستان"

پرانی دلی کے شاہی زمانے کے محلے"فراش خانے" میں لبِ سڑک میرا آبائی مکان تھا جو "خان بہادر میر ناصر علی کی حویلی" کے نام سے مشہور تھا۔رات کو سب لوگ اپنے اپنے مکانوں کی کھلی چھتوں پر سوتے تھے۔ذرا کی ذرا پلک جھپکتی کہ پھر من چلے نوجوانوں کا کوئی ریلا"چپ راست، چپ راست"! کرتا، گلے پھاڑ پھاڑ کے نعرے لگاتا، سڑک پر مارچ کرتا ہوا

گزرتا۔۔۔ان کی رزم آرائیوں کے اس بے پناہ شوروشغب میں بھلا کون سوسکتا تھا! محلے کے سب ہی لوگ جاگتے رہتے اور ایک ہمارے محلے پر ہی کیا موقوف تھا، پورا دلی شہر جاگتا رہتا اور صرف دلی شہر ہی نہیں قائدِ اعظمؒ کے نعرۂ رستاخیز سے پورے برِصغیر کے سب ہی مسلمان صدیوں کے خوابِ غفلت سے بیدار ہوچکے تھے۔

یہ نہیں کہ "اغیار" غافل تھے بلکہ بڑے پیمانے پر خوب تیاریاں کررہے تھے۔انہوں نے مسلمانوں سے "نپٹنے" کے لیے "راشٹریہ سیوک سنگھ" اور "جن سنگھ" اور "ہنومان سینا" کے ناموں سے دہشت گردوں کی لٹھ بند اور خنجر بردار تربیت یافتہ تنظیمیں قائم کررکھی تھیں، جن کے بڑے بڑے جتھے مسلم لیگی رضا کاروں کی طرح دن رات "ہر ہر مہا دیو" "بجرنگ بلی" "اکھنڈ بھارت" "جے ہند" کے نعرے لگاتے بازاروں میں گشت کرتے پھرتے تھے۔کبھی کبھی لیگی نیشنل گارڈوں کے ساتھ تصادم بھی ہوجاتا۔پتھراؤ ہوتا، لاٹھیاں چلتیں، سر پھٹتے، ہاتھ پیر ٹوٹتے، بازاروں میں بھگدڑ مچ جاتی، راہ چلتے لوگ بھی زخمی ہوجاتے۔آن کی آن میں یہ آگ دور دور تک پھیل جاتی اور بڑے پیمانے کے ہندو مسلم بلوے کی شکل اختیار کرلیتی۔بازار چوپٹ ہوجاتے اور ہڑتالیں ہوتیں جو کئی کئی دن تک جاری رہتیں۔اکا دکا قتل بھی ہوتے رہتے۔

یہ حالات تھے جب وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کانگریس اور مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ "منتقلی اختیارات" کے سلسلے میں حتمی مذاکرات شروع کئے۔وہ برِصغیر میں پھیلی ہوئی برطانوی شہنشاہیت کے صد سالہ دورِ جبروت کی بساط لپیٹ کر ہندوستان کے عوام کو حکومت کے اختیارات منتقل کرنے کے سلسلے میں برطانوی پارلیمنٹ اور خود شہنشاہ جارج ششم کی جانب سے لامحدود اختیارات لے کر آیا اخباری اطلاعات کے مطابق اسے خاص طور پر یہ ہدایت دی گئی تھی کہ حتی المقدور ہندوستان کی وحدت کو برقرار رکھا جائے اور ہندوستان کی نئی متحدہ حکومت کو برطانوی دولتِ مشترکہ میں بھی شامل رکھا جائے۔بعض اخبارات میں کچھ ایسے اشارے بھی شائع

ہوتے رہے جن سے پتہ چلتا تھا کہ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ایٹلی کی طرح اس کا طبعی جھکاؤ بھی کانگریس کی جانب تھا اور اس حقیقت کا تو وہ خود اعتراف کر چکا تھا کہ پنڈت جواہر لعل نہرو سے اس کی پرانی دوستی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کا اعلیٰ سطح کا سنجیدہ طبقہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ان مذاکرات سے کچھ زیادہ پر اُمید نہیں تھا، لیکن عوامی سطح پر قائد اعظمؒ کے فدائی اور ان کی بے مثال عزیمت و فراست پر ایمان رکھنے والے پُرجوش اعتقادلوگ دن رات دعائیں کرتے اور منتیں مان کر گویا اپنے دل میں یہ طے کئے بیٹھے تھے کہ پاکستان بس اب بنا کہ اب!

ایسے میں ہندوستان بھر کی نظریں دلی پر جمی ہوئی تھیں اور کان آل انڈیا ریڈیو سے لگے رہتے کہ کب کیا اور کیسی خبریں آتی ہیں؟

تین جون کو میں فجر کی نماز سے فارغ ہو کر جلدی جلدی تیار ہوا۔ آدھا پونا ناشتہ کر کے، اپنی بائیسکل پر سوار ہو کر اپنے دفتر براڈ کاسٹنگ ہاؤس، پارلیمنٹ سٹریٹ نئی دلی کی طرف چل پڑا۔ سان و گمان بھی نہ تھا کہ آج یعنی 3 جون 1947ء کا دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے لئے کتنا ہنگامہ خیز بن جائے گا اور اس سلسلے میں جو خدمات میرے سپرد کی جائیں گی وہ میرے لئے کس قدر لائق فخر ثابت ہوں گی!

اس یادگار دن کی جملہ کیفیات، افسران اعلیٰ کی بدحواسیاں، پریشانیاں اور ان سب سے زیادہ اپنے بعض جوشیلے ساتھیوں کی جذباتی حرکات کے نقوش، یہ سب میرے دل و دماغ پر آج تک اس طرح تازہ اور روشن ہیں کہ جیسے کل ہی کی بات ہو۔ ان تمام دلچسپ کیفیات کو بیان کرنے کے لئے تو دفتر کے دفتر اور لمبی فرصتیں درکار ہیں۔ تاہم تکلف اور بے جا کسر نفسی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مختصراً عرض کرتا ہوں۔

براڈ کاسٹنگ ہاؤس پہنچتے ہی معلوم ہوا کہ نئے کنٹرولر براڈ کاسٹنگ پی سی چوہدری صاحب سٹوڈیو نمبر 4 (جو براڈ کاسٹنگ ہاؤس کا سب سے بڑا سٹوڈیو تھا) میں سینئر افسران کی ایک اہم میٹنگ کریں گے۔ ہم لوگ کنٹرولر صاحب کی ایسی میٹنگوں کے بھی عادی تھے، لیکن آج کل

حالات میں غیر معمولی قسم کا تناؤ تھا، اس لئے میرا ماتھا ٹھنکا۔ان دنوں سردار ولبھ بھائی پٹیل جو کانگریس کے مردِ آہن کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے، ہندوستان کی عبوری حکومت میں وزیر داخلہ اور اس کے ساتھ وزیر اطلاعات ونشریات بھی بن گئے تھے۔جب سے قلمدانِ وزارت سنبھالا تھا، اپنی من مانی کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) کو جو خاصے عرصے سے آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر تھے، اپنی راہ کا کانٹا سمجھ کر، بڑی گہری چالوں سے تبدیل کرا چکے تھے۔ان کی جگہ اپنے خاص منظورِ نظر ایک کٹر مہاسبھائی پی سی چوہدری کو کنٹرولر مقرر کیا تھا اور ان کے ساتھ پوری کھیپ کی کھیپ بدنام ترین مسلم کُش ، اردو دشمنوں کی آل انڈیا ریڈیو پر مسلط کر چکے تھے۔ان ہی نام نہاد ماہروں میں ایک مہامہوپادھیائے شری نگیندر رنگاچ بھی تھے جو آل انڈیا ریڈیو کی زبان کی شدھی کرنے پر بطورِ خاص مامور کئے گئے تھے۔یعنی دلی کی روز مرہ کی بول چال اور سیدھی سادی اردو زبان کی جگہ پرچین زمانے کی پیچیدہ سنسکرت کی آلائش کے ساتھ مرہٹی اور کرناٹکی کے مردہ الفاظ کو شامل کر کے نہ جانے کیسی اُول جُلول زبان گھڑنے پر تعینات کئے گئے تھے۔ریڈیو سے نشر ہونے والے تمام مسودات کو اسی ''زبان'' میں رنگ کر کچھ کا کچھ بنا دیتے تھے اور جہاں تک ان کا بس چلتا تھا، ان کا حلیہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے تھے۔پروفیسر احمد شاہ بخاری، جو اب وزارت تعلیم سے منسلک ہو چکے تھے، نے ان صاحب ''نگیندر رنگاچ'' کا نام سن کر فرمایا کہ ''یہ تو آیورویدک کی کوئی سخت بدبودار جڑی بوٹی معلوم ہوتی ہے۔'' یہ پھبتی ان پر ایسی صادق آئی کہ اس دن سے ہم سب انہیں ''جڑی بوٹی'' ہی کہنے لگے۔

کنٹرولر صاحب کی اس میٹنگ میں ''جڑی بوٹی'' بھی تشریف فرما تھے۔ان کا کنٹرولر صاحب کی ہر میٹنگ میں موجود ہونا ضروری تھا۔ہمیں بتایا گیا کہ کنٹرولر صاحب کے نام وائسریگل لاج سے یہ اہم اطلاع پہنچی ہے کہ آج 3 جون 1947ء کی شام کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند، برطانوی حکومت کی جانب سے ایک خاص الخاص اعلان نشر کرنے کے لئے

براڈ کاسٹنگ ہاؤس تشریف لائیں گے۔ کنٹرولر صاحب نے سٹوڈیو کے دروازوں کی طرف دیکھا، یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا، بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ" نہ صرف وائسرائے بہادر اپنی تقریر نشر کریں گے بلکہ کانگریس کی طرف سے پنڈت جواہر لال نہرو، سکھوں کی طرف سے سردار بلدیو سنگھ اور مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح بھی وائسرائے کی پیش کردہ تجاویز کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں گے۔" اسی دوران کنٹرولر صاحب کا پی۔اے سٹوڈیو میں داخل ہوا۔کنٹرولر صاحب چونک پڑے۔ پی۔اے نے ان کے کان میں کچھ سرگوشیاں کیں۔کنٹرولر صاحب،"یس یس" کہتے رہے۔ وہ الٹے قدموں سٹوڈیو سے واپس چلا گیا تو کنٹرولر صاحب نے ایک لمبا سانس لیتے ہوئے فرمایا:"وائسرائے اور سب لیڈروں کی اصل تقریریں انگریزی میں ہی ہوں گی،لیکن پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر محمد علی جناح کی انگریزی تقریروں کے" ہندوستانی" ترجمے بھی ہوں گے اور ان کی تقریروں کے فوراً بعد نشر کئے جائیں گے اور یہ سب کچھ آج ہی شام کو ہوگا!"

آل انڈیا ریڈیو کی پوری تاریخ میں اتنا زبردست ہنگامہ کب ہوا تھا کہ ایسی مقتدر ہستیاں اپنی عہد آفریں تقریریں نشر کرنے کے لئے ایک ہی دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس تشریف لائیں۔ ان کے لئے کیسے کیسے زبردست انتظامات کرنے پڑیں گے۔کنٹرولر پی۔سی چوہدری کے اوسان خطا ہورہے تھے۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے۔آخر رشید احمد صاحب، سٹیشن ڈائریکٹر دہلی ریڈیو سٹیشن، بابو سبھرامونیم اور وسیکارامیہ سٹیشن انجینئرز نے اسے حوصلہ دلایا کہ سینئر سٹاف کے تعاون سے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔لیکن پی۔سی چوہدری کا اصرار تھا کہ گھبرانے کی ضرورت کیوں نہیں ہے؟ آخر ان سب مقتدر ہستیوں کو علیحدہ علیحدہ سٹوڈیو بھی دینے ہوں گے اور یہ احتیاط بھی مدنظر رکھنی ہے کہ سٹوڈیو سے آتے جاتے، ان میں سے کسی ایک کی دوسرے سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ پھر ان کی تقریروں کی کانٹی نیوٹی اناؤنسمنٹ کا بندوبست بھی کرنا ہوگا۔یہ کون لکھے گا؟ کون پڑھے گا؟ وغیرہ وغیرہ۔

رشید احمد صاحب نے دلاسہ دے کر کنٹرولر صاحب کو رخصت کیا اور سب انتظامات اپنے ذمہ لے لئے۔ طے پایا کہ وائسرائے کو سٹوڈیو نمبر 8 میں بٹھایا جائے جو تقریروں کا خاص سٹوڈیو تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو سٹوڈیو نمبر 5 میں، سردار بلدیو کو سٹوڈیو نمبر 7 میں اور قائداعظمؒ کو سٹوڈیو نمبر 4 میں بٹھایا جائے۔ ان سب سٹوڈیوز میں ایک ایک سٹینڈ بائی آفیسر مقرر کر دیا جائے جو اناؤنسمنٹ سنتا رہے اور اشارہ پاتے ہی اپنے اپنے اسٹوڈیو کے TALKER کو اپنی تقریر شروع کرنے کا اشارہ کر دے۔ کنٹی نیوٹی اناؤنسمنٹ، دہلی سٹیشن کے مشاق اناؤنسر ڈی میلو کریں گے۔

شام کی ٹرانس مشن ڈیوٹی کا آفیسر انچارج مجھے مقرر کر دیا گیا۔ رشید احمد صاحب سٹیشن ڈائریکٹر نے جو میرے مربی اور قدردان تھے، قائدِ اعظمؒ کی تقریر کا ترجمہ نشر کرنے کی خدمت بھی بطورِ خاص مجھے تفویض فرمائی۔ تقریروں کے مسودات کہیں چار پانچ بجے شام تک متوقع تھے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنی انگریزی تقریر کے بعد اس کا "ہندوستانی" ترجمہ بھی خود ہی نشر کریں گے۔ ان کی اور قائدِ اعظمؒ کی تقریروں کا ہندوستانی ترجمہ جڑی بوٹی صاحب تیار کریں گے۔ ان سب تقریروں کے اصل مسودات اور ان کے ترجمے سخت صیغہ راز میں یعنی "ٹاپ سیکرٹ" رہیں گے اور نشر ہونے سے صرف آدھ گھنٹہ پہلے "ریلیز" کئے جائیں گے۔

ادھر چیف انجینئر صاحب اور ان کا ماتحت عملہ براڈ کاسٹنگ ہاؤس کی صفائی ستھرائی، زیب و زینت میں مصروف ہو گیا، کیونکہ وائسرائے ہند بنفسِ نفیس تشریف لانے والے تھے۔ سیکورٹی کا انتظام بھی سخت کر دیا گیا۔ فن کاروں اور آرٹسٹوں وغیرہ کے آنے جانے پر کڑی پابندی لگا دی گئی اور تمام فالتو لوگوں کو چھٹی دے دی گئی۔ تیسرے پہر تک سارے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں ہُو کا عالم ہو گیا۔ ہندو افسران جو سب کے سب کٹر مہا سبھائی تھے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد راؤنڈ لگاتے اور ہر ایک کے "پاس" چیک کرتے اور باز پُرس کرتے کہ وہ اس وقت براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں کیوں پایا جاتا ہے۔ البتہ مسلمان کارکن جو تعداد میں چند ہی تھے، جن میں

بیشتر اناؤنسر، صدا کار، نیوز ریڈر اور سٹوڈیو کمشنر وغیرہ تھے، کسی نہ کسی حیلے بہانے سے موجود تھے۔ یہ سب مسلم لیگ کے حامی، پاکستان کے شیدائی اور قائدِ اعظمؒ کے دل و جان سے فدائی تھے۔ ان سرفروشوں کے جوش و خروش کا عالم نہ پوچھئے جو کوئی معقول حیلہ نہ تراش سکتے، وہ ہندو افسروں سے نظریں بچا کر، پہرہ چوکی کے باوجود کسی نہ کسی طرح براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے تہہ خانے اور پوشیدہ کونے کھدروں میں، الماریوں کے پیچھے اور میزوں کے نیچے دب جاتے۔ فدائیوں کے اس گروہ کے سرگرم رکن ریٹائرڈ رسالدار میر افضل خان سٹوڈیو کمشنر تھے۔ جلدی جلدی ان کا آپ سے مختصر سا تعارف کرا دوں:

بریلی کے رہنے والے جدی پشتی پٹھان، ڈھلتی عمر، بھاری بھرکم جسم، چوڑا چکلا سینہ، موٹی موٹی لٹکتی ہوئی مونچھیں جن میں اِکا دکا سفید بال، آج اپنی رسالداری کی پرانی وردی میں ملبوس تھے جو کہنیوں پر سے مسک گئی تھی۔ گزشتہ جنگی معرکوں کے متعدد تمغے لگائے جن کے بارے میں وہ قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ خالص سونے چاندی کے ہیں، لمبے لمبے پنولین بوٹ پہنے جن میں زنجیروں کے ساتھ مہمیزیں بھی تھیں، چھم چھم کرتے، اِدھر سے اُدھر انتظام و انصرام میں بھاگے پھر رہے تھے کہ لالہ بینی بھوش سٹوڈیو ایگزیکٹو نے انہیں جا پکڑا اور کڑک کر پوچھا ''رسالدار میر افضل خان! اس وقت تم یہاں کیسے؟''

رسالدار نے اپنا سر اٹھائے بغیر نہایت سادگی سے جواب دیا: جی میں ڈیوٹی پر ہوں۔''

''اس وقت تم کیسے ہو سکتے ہو ڈیوٹی پر، آج صبح ہی تو اپنی ڈیوٹی بھگتا چکے ہو۔ اس وقت کی ڈیوٹی تو حوالدار امریک سنگھ کی ہے۔ میں نے خود ڈیوٹی شیٹ پر اس کا نام لکھا ہے۔'' بینی بھوش نے چڑ کر کہا۔

''جی حوالدار صاحب کی اچانک طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ انہوں نے میرے سے ڈیوٹی کرنے کو کہا۔'' رسالدار نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''آپ کو معلوم ہے اس طرح افسروں کی اجازت کے بغیر آپس میں ڈیوٹی بدل لینا منع

ہے اور پھر آپ کیسے؟'' سٹوڈیوا یگز یکٹو بو لے۔

''اجی میں نے تو کسی سے اپنی ڈیوٹی نہیں بدلی۔ حوالدار امریک سنگھ نے میری منت سماجت کی کہ کسی طرح آج اس وقت کی میری ڈیوٹی تم بھگتا دو، اس لئے میں مجبور ہو گیا۔''

''لیکن افسروں کی منظوری کے بغیر آپ نے حوالدار کی ڈیوٹی کیوں لی۔ آج کے دن کسی کی ڈیوٹی ہرگز نہیں بدلی جا سکتی۔''

''میں نے بھی حوالدار صاحب سے یہی کہا تھا پر وہ میرے پاؤں پکڑنے لگے، کہنے لگے کہ میں بینی بھوش صاحب کی منت کر کے معافی مانگ لوں گا۔ تم میری حالت دیکھ لو، بھلا میں آج ڈیوٹی کرسکتا ہوں، میں تو کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ اس پر میں کیا کرتا، ناچار مجھے ان کی ڈیوٹی لینی پڑ گئی حالانکہ میرے گھر میں سے خود بیمار پڑی ہیں، پانی دینے والا بھی کوئی نہیں'' رسالدار نے کہا۔

''لیکن میرے پوچھے بغیر آپ کو آج شام کی ڈیوٹی ہرگز ہرگز نہیں لینی چاہئے تھی۔ آپ کی یہ ہمت کیسے ہوئی؟'' بینی بھوشن تیز ہوتا گیا۔

رسالدار بھی کہاں تک ضبط کرتا، سینہ پھلا کر بولا: ''تیز کیوں ہو رہے ہو بینی بھوشن صاحب! میں نے کسی سے اپنی ڈیوٹی نہیں بدلی۔ آپ کہیں تو میں ابھی واپس چلا جاتا ہوں، آپ اپنا بندوبست کرلیں۔''

بینی بھوشن جانتا تھا کہ اس وقت کوئی بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ ٹرانسمشن تھوڑی دیر بعد شروع ہونے والی تھی۔ اسے ڈر ہوا کہ اگر رسالدار چلا گیا تو کام سنبھالنے والا کوئی نہ ہوگا اس لئے ذرا نرم ہو کر بولا: ''خیر اس وقت تو آپ ڈیوٹی پوری کرلیں، کل آپ دونوں کی پیشی ہوگی اور جرمانہ کراؤں گا۔ آپ لوگوں کی ہٹ دھرمی نے ساری ایڈمنسٹریشن کا ناس کر رکھا ہے۔ اب یہ سینہ زوریاں یوں نہیں چلیں گی۔ سمجھے؟''

رسالدار نے اپنا چوڑا چکلا سینہ پھلا کر کہا: ''اجی کون کرے ہے سینہ زوری، میں اس

ذلیل نوکری پر لعنت بھیجتا ہوں، آپ شوق سے جرمانہ کرائیں بلکہ میرا استعفیٰ بھی لے لیں۔ جو ہوگی سو دیکھی جائے گی۔ہم سے بھی یہ روز روز کی بک بک جھک جھک اب برداشت نہیں ہوتی۔ہم خود اپنا سر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔'' رسالدار کے بریلوی لہجے میں تشدد نمایاں تھا۔اتنا کہہ کر رسالدار نے اپنے کوٹ کی جیب سے دس انچ لمبا کمانی دار چاقو نکال لیا اور چٹ چٹ اس کی کمانی کھول کر فضا میں لہرانے لگا۔بنی بھوش رسالدار کا چاقو دیکھ کر فوراً وہاں سے کھسک گیا۔میں نے لپک کر رسالدار کا بازو پکڑتے ہوئے کہا: ''بس بس جانے دیجئے رسالدار صاحب اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔''

رسالدار اپنا چاقو حملہ کرنے کے انداز میں گھماتے ہوئے بولا: ''چھوڑ دیجئے سید صاحب! میں بھی آج کعبہ شریف کی قسم کھا کر گھر سے نکلا ہوں۔آپ کو پتہ نہیں ان لوگوں کے تیور ہی بدل گئے ہیں۔پر میں نے للکار کر کہہ دیا ہے اور پھر کہے دیتا ہوں، یاد رکھنا اگر میرے سے کسی نے تین پانچ کی تو پیٹ پھاڑ دوں گا۔'' پھر رسالدار میر افضل خان اپنے چوڑے چکلے سینے پر ہاتھ مار کر بولا: ''ہم بریلی پٹھان ہیں اور جناب امیرؓ اور امام عالیؑ کے نام لیوا ہیں۔اپنا سر ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔سمجھ کیا رکھا ہے انہوں نے۔اجی اپنے شہنشاہ کی حفاظت اور خدمت کے لئے ان کے نام پر سولہ روپے میں آج کی ڈیوٹی خریدی ہے میں نے۔''

''کیا کہا ڈیوٹی خریدی ہے؟ میں نے پوچھا آپ تو کہہ رہے تھے کہ حوالدار امریک سنگھ بیمار ہو گیا تھا۔''

رسالدار سرگوشی کے انداز میں بولا: ''اجی وہ ملعون منحوس کب بیمار ہووے ہے...اب آپ سے کیا پردہ، میں خود سویرے سویرے اس کے گھر پہنچا۔فروز شاہ کے کوٹلے سے پالم جانا کوئی اٹھارہ میل کا چکر پڑا اور اس سے شام کی ڈیوٹی مانگی۔وہ خبیث کسی طرح نہیں مانتا تھا۔ آخر دھے کے لئے سولہ روپے اس کی ہتھیلی پر رکھے تب جا کر راضی ہوا، پرانا شرابی ہے نا۔''

''لیکن رسالدار صاحب آپ کو کیا سوجھی تھی کہ اتنی دور گئے اور آئے اور پھر اپنی گرہ سے سولہ روپے بھی اسے دے ڈالے۔''

رسالدار میر افضل خان کا چوڑا سینہ پھر ابھرا، اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک پیدا ہو گئی، خطیبانہ انداز میں بولا :لو بھئی سید صاحب! آپ نے بھی حد کر دی! پوچھتے ہیں مجھے کیا سوجھی تھی ۔لو بھئی حد ہو گئی! اورآج ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو کیا سوجھی ہے ۔آج ہمارا مدت کا پرانا خواب پورا ہونے کو ہے اور آپ پوچھتے ہیں مجھے کیا سوجھی تھی ۔اجی جناب پرتوکل اٹھارہ میل تھے پچاس میل بھی چلنا پڑتا تو میر افضل خان اپنے سر کے بل چل کر جاتا اور سولہ روپے تو کیا اپنی ساری تنخواہ بھی دینی پڑتی ، گھر کے زیور برتن بھی گروی رکھنے پڑتے تب بھی میں آج کی ڈیوٹی کسی اور کو ہر گز نہ کرنے دیتا ۔بھلا آپ خیال تو کریں ، ہمارے شہنشاہ قائداعظم محمد علی جناح آج کے دن براڈ کاسٹنگ ہاؤس تشریف لائیں اورمیر افضل کے زندہ ہوتے کوئی اوران کی کار کا دروازہ کھولے ،ڈوب نہ مرے میر افضل ! زندگی پھر کس دن کے لئے ہے ۔"

میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا شہزادہ جہانگیر صاحب الماری کے پیچھے دبکے کھڑے ہیں ۔یہ دہلی کے قدیمی مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔دراز قامت، گورا چٹا رنگ، تیکھے نقش، کھڑی ستواں ناک، گھنے کشیدہ ابرو، بڑی بڑی اور روشن مغلی آنکھیں، ان کا پورا نام مرزا سلیم الدین تیموری تھا۔عام طور پر لوگ انہیں شہزادہ جہانگیر کہتے تھے، نہایت رقیق القلب اور متقی واقع ہوئے تھے ۔ملی کاموں میں سرگرم حصہ لیتے تھے ۔مفلوک الحال تھے مگر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا عار سمجھتے تھے ۔قلیل سے معاوضہ پر سکول براڈ کاسٹ کے شعبے سے منسلک تھے ۔ان کی خاندانی وجاہت وشرافت اور ذاتی زہدوتقویٰ کے باعث ہم سب ان کا بڑااحترام کرتے تھے ۔یہ خود بھی ہمیں تبرکات کے نام سے وقتاًفوقتاًمزیدار اشیاء کھلاتے رہتے تھے ۔کبھی مدینہ منورہ کی کھجوریں، کبھی گیارہویں شریف کے پیڑے اور برفیاں، کبھی سترھویں شریف کی ریوڑیاں اور بتاشے، کبھی کسی اورعرس یا دینی تقریب کے چھوارے، بادام، پستے اور کشمش وغیرہ، اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو کے مسلمان افسروں کو اسلامی کیلنڈر بھی باقاعدگی کے ساتھ دیتے رہتے تھے ۔ان ہی کا عطا کردہ ایک کیلنڈر جس پر گنبد خضریٰ کا نقش چھپا ہوا تھا،میرے کمرے میں بھی آویزاں تھا۔

شہزادہ جہانگیر صاحب پسینے میں شرابور تھے، لیکن اس وقت بھی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔میں نے انہیں پنکھے کے نیچے بٹھایا، پانی کا گلاس پیش کیا، جسے پینے سے انہوں نے معذوری ظاہر کی۔معلوم ہوا کہ روزے سے ہیں۔مجھے کچھ حیرت سی ہوئی، پوچھ بیٹھا :

''شہزادے میاں! بھلا آج روزہ رکھنے کا کیا موقع تھا؟''

چند لمحے خاموش رہے، اپنی نظریں نیچی کرلیں، پھر اٹھائیں، میں نے دیکھا ان کی مغلی آنکھیں عجیب سی جلالی چمک سے روشن تھیں، کہنے لگے: ''آج سے بہتر اور کون سا مبارک دن ہوسکتا ہے۔آج ربانی عطا کا دن ہے۔آج کے دن قضاوقدر کی جانب سے بڑے اہم حکم صادر ہونے والے ہیں۔اغلب ہے کہ آج ہی ملّت کی آزادی اور پاکستان کے حصول کے بارے میں کوئی حکم صادر ہوجائے گا۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: ''شہزادے میاں! آپ کو کیسے اندازہ ہوا کہ آج پاکستان بننے کا کوئی فیصلہ ہوجائے گا؟''

''فیصلہ نہیں، بخشش کہئے۔فیصلے کے لئے استحقاق ضروری ہوتا ہے جبکہ ہمارا کوئی استحقاق نہیں ہے۔البتہ عطا اور بخشش استحقاق کے بغیر ہی ملتی ہے۔پاکستان اللہ کریم اپنے اور اپنے حبیب پاک حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے نام نامی کی حرمت میں کلمہ گویانِ رسول کو عطا کرے گا۔ان شاءاللہ!'' شہزادے نے کہا۔

''جی یہ تو درست ہے مگر کیا ضروری ہے کہ یہ عطا اور بخشش آج ہی نازل ہونے والی ہو؟'' میں نے پھر پوچھا۔

شہزادے صاحب نے پھر اپنی نظریں نیچی کرلیں اور پھر آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھائیں اور کیلنڈر پر بنے ہوئے گنبدِ خضریٰ کے عکس پر جماتے ہوئے دھیمے انداز میں بولے: ''عطائے ربانی کی بھی شانیں ہوتی ہیں۔قرآن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔آخر اتنے مہینوں سے مسجدوں میں، خانقاہوں میں قرآن خوانیاں ہوتی رہی ہیں، حضور نبی محتشم کریم ﷺ پر کروڑوں کی تعداد

میں درود پاک کے نذرانے پیش کئے جارہے ہیں ۔ دلی کے بائیس خواجگانِ کرام کے مزارات پر کیسی کیسی دعائیں مانگی جاتی رہی ہیں ۔ آپ کو کیا معلوم ہے! حضور نبی کریم ﷺ کی بارگاہِ رحمت سے حکم صادر ہو چکا ہے ۔ بصیرت والے بشارت پا چکے ہیں ۔ ۔ ۔''

میں نے دیکھا کہ شہزادہ میاں کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں تھے، لیکن وہ ضبط کرتے ہوئے پھر بولے: ''آپ نے مولانا حسرت موہانی کے اشعار تو سنے ہوں گے جن میں انہوں نے حضور نبی کریم ﷺ کی عطا کی ہوئی بشارت کا ذکر کیا تھا اور پھر دیوانِ حافظ کی فال بھی نکالی تھی''؟

''جی ہاں، میں نے سنے تو تھے، آپ کو یاد ہیں مولانا حسرت موہانی کے وہ اشعار؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ بھلا کبھی بھلائے جاسکتے ہیں ۔ سنئے:

جب کہے خواب میں آ کے وہ شہہِ محبوباں
جبکہ حافظ بھی مصدّق ہو بہ فالِ دیواں
تجھ کو حسرت ہو مبارک یہ سند و مُہر و نشاں
پردہ بردار کہ تا سجدہ کُند جُملہ جہاں
طاقِ ابروئے تو محرابِ جہاں خواہد بود

کوئی ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہوگا کہ محمد سرفراز صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے (آج ان کے نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے) قیامِ پاکستان کے سلسلے میں اطلاعات و نشریات کے شعبوں میں جو انہوں نے بیش بہا خدمات انجام دیں وہ ہماری قومی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، لیکن یہ تاریخ کون لکھے گا ۔ آج پاکستان بھر میں گنی چنی چند ہستیوں کے سوا جو خود لبِ گور ہیں، محمد سرفراز کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں اور ایک ان ہی پر کیا موقوف ہے، ایسے کتنے ہی سرگرم سرفروش ''سرفرازوں'' کو ہم کب کا بھلا چکے

ہیں۔ یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ اس قسم کی "رجعت پسندانہ" باتوں کا بھلا دینا اور ان جیسے ہزاروں خاموش کارکنوں کے خون سے رقم کئے ہوئے نقوش کو مٹا ڈالنا ہی "ترقی پسندی" کا معیار بن چکا ہے۔

محمد سرفراز نے آتے ہی قائدِاعظمؒ کی اصل انگریزی تقریر اور اس کا ہندوستانی ترجمہ میرے آگے رکھ دیا اور بولے : لے استاد! تو بھی کیا یاد کریگا، پی سی چوہدری سے لڑ بھڑ کر وقت سے پہلے ہی بابا کی تقریر اور اس کا ترجمہ نکلوا لایا ہوں۔ اب اس ترجمے کو جلدی سے درست کر ڈالو۔ نہایت واہیات بھاشا لکھی ہے اس ظالم نے قائدِاعظمؒ کی تقریر کے ترجمے کی۔

میں نے ترجمہ پر ایک نظر ڈالی تو اپنا سر پکڑ کر رہ گیا۔ نویدن، وشواش، سمے، آویشکتا، سہائتا، گھٹنا، انوبھوتی، گھٹنائیاں جیسے ہزاروں کڈھب الفاظ کی بھرمار تھی اور جملوں کی ترکیبیں تھیں، وہ بھی ایسی ہی بے تکی اور جھوجھری۔ فقرے کے فقرے بے جوڑ اور غیر مربوط۔ تاثر اور زور کا تو کیا مذکور، معنی اور مطلب تک مبہم تھے۔ ان سے پوچھا: "کس نے کیا ہے یہ ترجمہ؟"

سرفراز صاحب ہنستے ہوئے بولے: "اسی جڑی بوٹی نے کیا ہوگا، اور بھلا کون کر سکتا ہے۔ خیر اس پر لعنت بھیجو اور تم خود زوردار اردو میں ترجمہ کر ڈالو جو بابا کے شایانِ شان ہو، سمجھے۔ اچھا میں چلتا ہوں، شام کو بابا کے ساتھ ہی آؤں گا" اتنا کہہ کر محمد سرفراز صاحب چلے گئے۔

میں نے پھر ترجمے پر نظر ڈالی۔ قائدِاعظمؒ کی قانونی زبان اور ان کے مخصوص اسلوبِ بیان کو الٹی چھری سے ذبح کیا گیا تھا۔ بین السطور جو گہرے مطالب اور کنائے تھے، ان کو توڑ مروڑ کر کچھ کا کچھ بنا دیا گیا تھا۔ اگر قائدِاعظمؒ کی اس تقریر کا یہ ترجمہ اسی صورت میں نشر کر دیا جاتا تو برِصغیر کے کروڑوں مسلمان جو آج ہندوستان بھر میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنے اپنے ریڈیو سے کان لگائے بیٹھے تھے، اس کا کچھ بھی مطلب نہ سمجھ سکتے اور ان کی بڑی دل شکنی ہوتی۔ میرے قلب و روح کو کسی طرح گوارا نہ ہوا کہ پاکستان اور اردو کے نام پر پہلی بسم اللہ ہی غلط ہو جائے۔ لہٰذا میں نے "جڑی بوٹی" کے اس منظور شدہ ترجمے کو نظر انداز کر کے اور اس بنیاد

پر افسرانِ اعلیٰ بلکہ وزیرِ نشریات سردار ولبھ بھائی پٹیل کی شدید ناراضگی کا خطرہ مول لیتے ہوئے، قائدِ اعظمؒ کی اصل انگریزی تقریر سے اس کا روزمرہ کی اردو میں ازسرِ نو ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ وقت کم تھا، ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میرا قلم وقت کے خلاف دوڑ رہا تھا۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ میرے کمرے میں رکھی ہوئی صراحی کب کی خالی ہو چکی تھی اور پانی کا کہیں دُور دُور تک پتہ نہیں تھا۔ کینٹین وغیرہ سب بند پڑے تھے کہ اتنے میں رسالدار میر افضل خان برف کے پانی سے بھرا تھرماس اور گلاس اٹھائے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔

"لیجئے، سید صاحب! برف والا پانی نوش فرمایئے۔"

"ارے رسالدار صاحب! اس وقت تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ کہاں سے لے آئے ٹھنڈا پانی؟"

"اجی، میرا کہاں کا کمال! یہ تو سب مولا کا کرم ہے۔ کنٹرولر صاحب نے وائسرائے بہادر اور پنڈت جواہر لال نہرو کے سٹوڈیوز میں رکھوانے کے لئے برف کا پانی بنوایا تھا۔ میں نے بھی اپنے شہنشاہ (قائدِ اعظمؒ) کے لئے تھرماس بھر لیا، آخر وہ بھی تو "آج کے ٹاکر (مقرر) ہیں۔۔۔اور لیجئے نا۔"

"جی نہیں، بس، جزاک اللہ! آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

رسالدار صاحب نے میرے سامنے ٹائپ شدہ کاغذ بکھرے دیکھ کر بڑے اشتیاق اور دلچسپی سے پوچھا: "کیا ٹاک (تقریر) آ گئی قائدِ اعظم کی"؟

"ہاں" میں مختصر سا جواب دے کر پھر ترجمہ کرنے کے کام میں مشغول ہو گیا۔

"اللہ کی قسم!!" رسالدار کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"ہاں، ہاں یہ قائدِ اعظم کی ٹاک کا مسودہ ہی تو ہے۔"

رسالدار میر افضل خان نے جھٹ ہاتھ سے گلاس میز پر رکھا، اپنے دونوں ہاتھ کوٹ کے

دامن سے پونچھے اور انتہائی ادب و تکریم کے ساتھ قائداعظم کی تقریر کے مسودے کو احتیاط سے اٹھایا۔ اسے والہانہ انداز میں چوما اور اپنے سر پر رکھ کر پھر مجھے واپس کر دیا۔ پھر میرے قریب آ کر آہستگی سے پوچھا: ”بس اتنا بتا دیجئے سید صاحب! اپنا پاکستان مل گیا نا؟“

”ہاں، ہاں، مل ہی سمجھو۔“

رسالدار ایک دم سے کھل اٹھے، پھر بہت ہی رازدارانہ انداز میں بولے۔

”اپنی بریلی بھی آ گئی پاکستان میں؟؟“

”بھئی آپ کی بریلی کیسے آ سکتی ہے پاکستان میں، وہ تو یوپی میں ہے نا؟“

رسالدار پر قدرے اداسی سی چھا گئی۔ پھر آہستہ سے بولے: ”جی ہاں، ہمیں پہلے ہی ڈر تھا کہ بریلی پاکستان میں شامل نہیں ہو گی۔ خیر اللہ کرے مسلمانوں کا اپنا ملک پاکستان بن جائے، ہمارے لئے پاکستان ہی بریلی، مرادآباد امروہہ اور لکھنؤ ہے۔ جہاں اپنے سب مسلمان بھائی ہوں گے، اپنا ملک اپنی حکومت ہو گی، ہمارے لئے جنت سے کیا کم ہے۔ اللہ سلامت اور آباد و شاد رکھے پاکستان کو اور سب اپنے پاکستانی بھائیوں کو، ہم بھی ان سے آن ملیں گے۔ ایک نہ ایک دن۔۔۔ ان شا اللہ!“

اتنے میں براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے سامنے شور بلند ہوا: ”جے ہند۔ اکھنڈ بھارت کی جے۔ بھارت ماتا کی جے۔“

میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، چند سادھو اپنے چمٹے بجا بجا کر شور مچا رہے تھے کہ ہم بھارت کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے، وغیرہ۔

ان سادھوؤں کو پولیس نے نہایت چابکدستی سے گرفتار کر کے اپنی گاڑی میں بند کیا اور انہیں جمنا پار پہنچانے لگے کیونکہ انہوں نے دفعہ 144 کی خلاف ورزی کی تھی جو سر شام ہی سے نافذ کر دی گئی تھی۔

ان شور مچانے والے سادھوؤں کو پولیس کا عملاً اپنی دین میں پوری طرح بند نہ کر پایا تھا کہ

وائسریگل سٹاف کی کاریں براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے سامنے والے پارکنگ میدان میں داخل ہوگئیں۔لارڈ ماؤنٹ بیٹن وائسرائے ہند اپنے چند مشیرانِ کرام کے ساتھ (جن میں ان کا پریس اٹیچی کیمبل جانسن بھی تھا) مقررہ وقت سے خاصے پہلے آ گئے۔پی۔سی چوہدری کنٹرولر اور سردار ولبھ بھائی پٹیل، جو اوپر کی منزل میں اپنے کمرے میں تھے، اپنے اپنے پیٹ پکڑے، دھم دھم کرتے سیڑھیوں سے اتر کر وائسرائے کے استقبال کے لئے نیچے آئے، لیکن وائسرائے اور ان کا عملہ ان استقبال کرنے والوں کا انتظار کئے بغیر سٹوڈیو کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ان کے پیچھے پیچھے کنٹرولر اور وزیرِ نشریات بھی ہانپتے کانپتے پہنچ گئے۔میں بھی اپنے کمرے سے نکل کر ڈیوٹی روم میں آ چکا تھا اور کھڑکی سے اس دلچسپ تماشے کو دیکھ رہا تھا۔

وائسرائے کو وہ تمام سٹوڈیو دکھائے گئے جہاں سے پنڈت جواہر لال نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور قائدِ اعظمؒ اپنی اپنی تقریریں نشر کریں گے اور وہ خاص الخاص سٹوڈیو نمبر 8 بھی دکھایا گیا جو خود وائسرائے کی تقریر کے لئے مختص کیا گیا تھا لیکن نہ معلوم کیوں، وائسرائے بہادر نے اس سٹوڈیو سے اپنی تقریر نشر کرنا پسند نہیں فرمایا۔وہ شاید دیگر لیڈرانِ کرام کے "ہجوم" سے کہیں دور بالکل علیحدہ سٹوڈیو سے اپنی تقریر نشر کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ کنٹرولر صاحب انہیں نیوز کے سٹوڈیوز کی طرف لے گئے، ان کا عملہ بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔نیوز کے ایک سٹوڈیو کو وائسرائے نے پسند فرمالیا۔اس لئے طے پا گیا کہ ان کی تقریر وہیں سے نشر ہوگی۔ان کا عملہ برابر کے سٹوڈیو میں بیٹھ کر ان کی تقریر سنتا رہے گا اور پھر ان کے وہ خاص مشیر جنہیں برطانوی منصوبے کا متن نشر کرنا تھا، وہ بھی اسی سٹوڈیو سے نشر کریں گے۔ غالباً یہ لارڈ اسمے (ISMAY) ہی کو نشر کرنا تھا۔

وزیرِ نشریات سردار ولبھ بھائی پٹیل اور کنٹرولر پی سی چودھری ادھر وائسرائے بہادر کی ٹہل سیوا میں لگے رہے اور میں جلدی سے رشید صاحب کے مشورے سے سٹوڈیوز کی ادل بدل سے ڈی میلو اناؤنسر اور دیگر سٹینڈ بائی افسران کو خبردار کرتا رہا۔سٹوڈیو نمبر 8 جسے خاص طور پر آرائش و

زیبائش کے بعد وائسرائے کے لئے مختص کیا گیا تھا اور جس میں بیٹھنے سے وائسرائے نامعلوم وجوہ کی بنا پر انکار کر چکے تھے، طے پایا کہ اب اسے قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریر کے لئے مقرر کر دیا جائے۔ دیگر حضرات کے لئے ان کے وہی مقرر کردہ سٹوڈیوز رہیں گے۔

چند لمحے بعد پنڈت جواہر لال نہرو اور ان کے پیچھے پیچھے سردار بلدیو سنگھ بھی براڈکاسٹنگ ہاؤس پہنچ گئے۔ ہندو عملے کے کچھ لوگوں نے "جے ہند" کے نعروں سے ان دونوں کا استقبال کیا۔ پنڈت جی، حسبِ معمول کھدر کا کرتا اور تنگ پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ جوڑ کر سب کو پرنام کیا۔ سردار بلدیو سنگھ البتہ اس شدید گرمی میں بھی تین پیس کا سوٹ زیب تن کئے ہوئے تھے اور سر پر شوخ بسنتی رنگ کی پگڑی باندھے ہوئے تھے۔ پرنام کرنے میں بھی پنڈت جی کا ساتھ دیتے رہے۔ رشید احمد صاحب اور سٹیشن انجینئر نے ان دونوں کو ان کے مقرر کردہ سٹوڈیو تک پہنچایا۔ پنڈت نہرو نے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہی اپنی تقریر اور اس کے ہندی ترجمے کے مسودے مانگے، جو فوراً ان کو دے دیے گئے۔ پنڈت جی اپنی تقریر کے ہندی ترجمے کو دیکھ بہت جھنجھلائے اور اپنی چپل اتار کر سٹوڈیو نمبر 5 کے فرش پر ہی بیٹھ گئے اور اس ترجمے کی "مرمت" کرنے لگے۔

سردار بلدیو سنگھ نے بھی سٹوڈیو میں بند ہو کر بیٹھنا پسند نہیں کیا کیونکہ وہ اپنی تقریر کے ترجمے وغیرہ کے چکر میں مبتلا نہیں ہوئے تھے، اس لئے گیلری میں ٹہل ٹہل کر دوسرے سٹوڈیوز کے شیشے سے جھانک کر گانے کا پروگرام براڈکاسٹ ہوتا دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے۔ پونہ والی گلاب بائی غالب کی یہ غزل گا رہی تھی، جسے سردار جی بڑے انہماک سے سنتے رہے:

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
اِک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کئے ہوئے

شام کو ٹھیک سات بجے، ہز ایکسی لینسی لارڈ ماؤنٹ بیٹن گورنر جنرل آف انڈیا کی تقریر شروع ہو گئی۔ انگریزی زبان کی شوکت اور خود ان کی شاہانہ تمکنت، ایک ایک لفظ سے عیاں تھی۔ انہوں نے لیڈرانِ کرام کے مابین مصالحت کی کوشش میں اپنی ناکامی پر افسوس کرتے ہوئے، باامر مجبوری۔۔۔ تقسیم ملک۔۔۔ کا چارہ کار اختیار کرنے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے دکھ کا اظہار کیا، لیکن اور کرتے بھی کیا! بہر حال ان کا نشریہ مجموعی طور پر دلکش تھا۔

وائسرائے کے بعد ان کے مشیرِ خاص (لارڈ اسمے) نے برطانوی حکومت کا تیار کردہ منصوبہ پڑھنا شروع کیا۔ یہ خاصا اکتا دینے والا نشریہ تھا، لیکن نفسِ مضمون کے اعتبار سے بہت اہم تھا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو اور سردار بلدیو سنگھ اپنے اپنے سٹوڈیوز میں بیٹھے اس منصوبے کی جملہ تفاصیل کو بڑے غور سے سن رہے تھے کیونکہ اسی کے ذریعے اہلِ ہند کے نام حکمت کے اختیارات منتقل ہونے تھے۔ ادھر رسالدار تو بالکل چھلاوہ بنا ہوا تھا۔ کبھی براڈکاسٹنگ ہاؤس کے صدر دروازے تک جاتا، کبھی پارکنگ میدان میں پہنچ جاتا، کبھی پھر واپس آ کر فائر (FOYER) کا چکر لگاتا، پھر ہال میں جاتا، پھر باہر جھانکتا رہتا۔ میں نے کئی بار رسالدار سے پوچھا: ''کیوں بھئی! آ رہے ہیں؟''

''جی نہیں۔''

''ان کی کار آتی دکھائی دی؟''

''جی نہیں، دُور دُور تک کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔''

''پھر دیکھو، شاید اب آ رہے ہوں؟''

''جی نہیں صاحب۔ غضب ہو رہا ہے۔ ابھی تک تشریف نہیں لائے۔ اب کیا ہو گا؟''

گھبراؤ نہیں، قائداعظم ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں گے۔ وہ کبھی کہیں لیٹ نہیں ہوتے۔''

''کہیں راستے میں ان کی کار نہ خراب ہو گئی ہو۔ سٹوڈیو کار بھیج دیں۔؟؟

''نہیں نہیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پہلے ان کی کوٹھی پر ٹیلی فون کر کے دیکھ لو۔ نمبر 10 اورنگ زیب سٹریٹ۔''

اتنے میں رسالدار، ہال میں کھڑے کھڑے زور سے چلایا"آ گئے آ گئے آ گئے۔!!''

رشید صاحب، عباسی خان اور میں ہال میں سے گزر کر صدر دروازے تک دوڑے۔ رسالدار میر افضل تو جیسے ہوا بن کر اُڑ گیا۔ زور سے ہارن بجا۔ گہرے نیلے رنگ کی کار براڈ کاسٹنگ ہاؤس کے داہنی طرف کے دروازے سے داخل ہوئی اور شان وشوکت کے ساتھ درمیانی رفتار سے دوڑتی ہوئی، عین صدر دروازے کے آگے آن کر رُک گئی۔

رسالدار میر افضل اتنی تیزی سے لپکا کہ اگلے پہیوں کے نیچے آتے آتے بچا۔ اس نے آگے بڑھ کر جھٹ سے کار کا دروازہ کھولا، اور پھر اٹینشن ہو کر بالکل بت بن کر کھڑا ہو گیا۔

قائدِ اعظمؒ ہلکے سرمئی رنگ کا شاندار سوٹ زیب تن کئے، مسکراتے ہوئے برآمد ہوئے۔ رسالدار میر افضل نے اپنے چوڑے چکلے سینے اور گلے کی پوری طاقت اور پھیپھڑوں میں بھری ہوا کی آخری رمق کو بروئے کار لاتے ہوئے نعرہ لگایا: "قائدِ اعظمؒ زندہ باد۔۔۔پاکستان زندہ باد!!''

قائدِ اعظمؒ نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ رسالدار میر افضل خان نے جیسے آج ہی کے دن کے لئے عمر بھر رسالداری کی تھی، پوری فوجی شان اور عسکری طمطراق سے اپنے چوڑا چکلا سینہ چھ انچ باہر نکال کر اس پر لگے تمغوں کی قطار کو جھنجھناتے ہوئے، دونوں ایڑیاں کھٹاک سے ملا کر بجلی کے سے جھٹکے کے ساتھ قائدِ اعظمؒ کو نہایت شاندار "سیلوٹ'' کیا۔ قائدِ اعظمؒ نے اس کے زوردار سلیوٹ کا جواب اپنی پیشانی تک اپنا داہنا ہاتھ لے جا کر سلام سے دیا۔ پھر رشید احمد صاحب سے اس کا نام پوچھا اور مسکراتے ہوئے اسکی طرف مصافحہ کرنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ رسالدار خوشی سے ایک دم بوکھلا سا گیا۔

جس انداز سے رسالدار نے قائدِ اعظم سے مصافحہ کیا، میں عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ یا تو جلالی قسم کا سلیوٹ تھا، ایک دم عجز و انکسار کی تصویر بن گیا! جھک کر قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ تھامے ہوئے، قریب تھا کہ قائدِ اعظمؒ کے ہاتھ کو بوسہ دے یا آنکھوں سے لگا لے کہ قائدِ اعظمؒ نے ملائمت سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

قائداعظمؒ کی نشری تقریر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"۔۔۔ میں خوش ہوں کہ آج مجھے دہلی کے اس ریڈیو کے ذریعے آپ حضرات سے براہِ راست گفتگو کا موقع دیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی غیر سرکاری شخص کو اس طاقتور آلہ کے ذریعے، سیاسی مسائل پر عوام سے براہِ راست خطاب کرنے کا موقع دیا گیا ہے۔ یہ آغاز اچھا ہے اور مجھے امید ہے کہ مستقبل میں مجھے ایسی سہولتیں زیادہ حاصل ہوتی رہیں گی تا کہ آپ لوگوں تک میرے خیالات اورنظریات اخباروں کی سرد و جامد الفاظ کی بجائے زندگی کی حرارت سے براہ راست پہنچ سکیں"۔

"ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کا اعلان، جس میں حکومت کے اختیارات ہندوستان کے عوام کو منتقل کرنے کا اعلان شامل ہے نشر کیا جا چکا ہے اور پریس کو بھی جاری کر دیا جائے گا تا کہ کل صبح ہندوستانی اور بیرونی اخبارات میں شائع ہو جائے۔ اس اعلان میں منصوبے کی دو باتوں کی تفصیل بیان کر دی گئی ہے، تا کہ ہم ان پر ہر طرح غور و فکر کر سکیں۔ ہمیں اس منصوبے پر غیر جذباتی انداز میں، نہایت ٹھنڈے دل سے غور وخوض کرنا ہے۔

"ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم کو بے حد اہم فیصلے کرنے ہیں اور اس برصغیر کے چالیس کروڑ باشندوں کے پیچیدہ سیاسی مسائل کو حل کرنے میں جو انتہائی نازک دشواریاں حائل ہیں، ان سے بخوبی عہدہ برآ ہونا ہے۔ اس وقت جیسے اہم اور مشکل فرائض ہمیں انجام دینے ہیں، دنیا کی تاریخ میں کہیں ان کی نظیر نہیں پائی جاتی۔

"اس وقت ہم سب پر اور خاص طور پر ہندوستان کے لیڈروں پر نہایت ہی سنگین ذمہ داریاں عائد ہیں۔ اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم متحد ہو کر اپنی تمام قوتوں کو یکجا کر لیں تا کہ اختیارات کی منتقلی کا کام پُرامن اور منظم طریقے سے انجام پا سکے۔ میں ہر فرقے کے لوگوں سے، اور بالخصوص مسلمانوں سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ وہ نظم وضبط برقرار رکھیں۔ ہمیں اس منصوبے

کے ایک ایک لفظ پر، اس کے معنی اور مطالب پر، اچھی طرح غور فکر کرنا ہے، ان سے اپنے نتائج اخذ کر کے، پھر خود اپنے فیصلے کرنے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس نازک اور کٹھن وقت میں ہماری رہنمائی فرمائے اور ہمیں ان اہم ذمہ داریوں سے دانشمندی اور تدبر کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے!

"یہ تو ظاہر ہی ہے کہ یہ منصوبہ، بعض اہم معاملات میں، ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق نہیں۔ اس لئے ہم یہ نہیں سمجھتے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس منصوبے سے مطمئن ہیں، یا بعض تجاویز سے، جو اس میں بیان کی گئی ہیں، متفق ہی ہیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم اس پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہز مجسٹی کی حکومت کی جانب سے جو منصوبہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے آیا ہم اسے ایک مصالحتی سمجھوتہ مان کر یا ایک تصفیہ کے طور پر قبول کر لیں؟ میں اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے فیصلے کی پیش بندی نہیں کرنا چاہتا، اس کا اجلاس 9 جون کو طلب کیا گیا ہے۔ کونسل ہی ہمارے دستور، ہماری سابقہ روایات اور طریقہ کار کے مطابق، آخری فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ لیکن جہاں تک میں مجموعی طور پر اندازہ لگا سکا ہوں، دہلی کے مسلم لیگی حلقوں میں جو تاثر پایا جاتا ہے، وہ امید افزا معلوم ہوتا ہے۔ بلا شبہ کوئی آخری فیصلہ کرنے سے پہلے منصوبے کی خوبیوں اور خامیوں اور تمام پہلوؤں پر پوری احتیاط کے ساتھ غور و خوض کیا جانا ضروری ہے۔

"جو منصوبہ ابھی نشر کیا گیا ہے اس کے پیراگراف نمبر گیارہ سے یہ بات عیاں ہے کہ شمال مغربی سرحد صوبہ کے رائے دہندگان خود اس امر کا فیصلہ کریں گے کہ منصوبے کے پیراگراف نمبر چار میں جو دو متبادل تجویزیں درج ہیں، وہ ان میں سے کس تجویز کو منتخب کرتے ہیں۔ یہ استصواب رائے گورنر جنرل کی زیر نگرانی صوبائی حکومت کے مشورے سے کیا جائے گا۔ اس طرح یہ واضح ہو گیا ہے کہ صوبہ سرحد کے عوام کی اکثریت کی رائے اور فیصلہ ہی سے یہ بات طے پائے گی کہ وہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی میں۔ اندریں حالات، میں سرحد کی صوبائی مسلم لیگ سے یہ درخواست کرتا ہوں وہ اپنی پُرامن

سول نافرمانی کی تحریک کو، جو انہیں بدرجہ مجبوری شروع کرنی پڑی تھی، اب ختم کر دیں۔ میں مسلم لیگ کے تمام لیڈروں سے اور سب مسلمانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ ہمارے عوام کو منظم کریں تا کہ وہ استصواب رائے میں ہمت اور حوصلہ کے ساتھ پُرامید ہو کر بھرپور حصہ لیں۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ سرحد کے عوام متفقہ طور پر، یک دل اور ایک زبان ہو کر، بھاری اکثریت سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں ہی شامل ہونے کا فیصلہ کریں گے۔

"ہمارے شہری آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں مسلمانوں کے تمام طبقوں نے جیسی تکلیفیں اٹھائیں اور قربانیاں دیں، خاص طور سے سرحد کی غیور خواتین نے جو عظیم خدمات انجام دیں، ان سب کے لئے میں تشکر اور امتنان کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی پر کوئی الزام عائد کئے بغیر، جس کا یہ کوئی موقع بھی نہیں ہے، میں ان تمام لوگوں کے ساتھ گہری ہمدردی رکھتا ہوں، جنہوں نے ہماری جدوجہدِ آزادی میں مصیبتیں برداشت کیں، جو اس راہ میں شہید ہوئے اور جن کی جائیداد و املاک برباد کی گئیں۔

"مجھے پوری امید ہے کہ صوبہ سرحد میں ریفرنڈم پُرامن طریقے پر ہو گا۔ ہر شخص کو پوری پوری کوشش کرنی چاہیے کہ صوبہ سرحد کے عوام کی صحیح اور سچی، آزادانہ اور منصفانہ رائے حاصل کی جائے۔

"میں دوبارہ تمام لوگوں سے امن و امان اور نظم و ضبط برقرار رکھنے کی پُرزور اپیل کرتا ہوں۔

پاکستان ۔۔۔۔۔زندہ باد"

قائداعظمؒ اپنی انگریزی تقریر نشر کرنے کے بعد اسی سٹوڈیو نمبر 8 میں بیٹھے، لاؤڈ سپیکر سے اپنی اس تاریخی تقریر کا اردو ترجمہ بغور سنتے رہے۔ قائداعظمؒ کے تشریف لے جانے کے بعد محمد سرفراز نے مجھے بتایا کہ قائداعظمؒ نے میرے اس نشریے کے اختتام پر اپنے مخصوص انداز میں "گڈ" کہہ کر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

ادھر پنڈت جواہر لال نہرو اپنی تقریر کا مرمت شدہ ہندی ترجمہ، اٹک اٹک کر پڑھنے کے بعد بپھرے ہوئے انداز میں لال پیلے ہوئے، اپنے سٹوڈیو نمبر 5 سے باہر نکلے اور پی سی

چودھری (کنٹرولر) پر خوب ہی گرجے برسے "تقریر کا ایسا واہیات اور کنڈم ہندی ترجمہ کیوں تیار کرایا گیا جس میں بے شمار سنسکرت اور گجراتی مرہٹی کے الفاظ بے موقع گھسیڑے گئے جبکہ سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میری زبان ٹھیٹھ ہندوستانی ہے۔ میں جنتا کے سامنے ہمیشہ ہندوستانی زبان میں ہی تقریر کرتا ہوں لیکن آج کی میری اتنی اہم تقریر کا ایسا غلط سلط ترجمہ جنتا کی سمجھ میں خاک آیا ہوگا۔ اس طرح تم نے ہندوستان کی پوری جنتا کے سامنے میری سخت بے عزتی کروائی ہے۔ یہ ہیں، تمہارے کرتوت!!"

اتنا کہہ کر وہ اپنی تقریر کے ہندی ترجمے کا مسودہ چودھری (کنٹرولر) کے منہ پر مار کے، اپنے پیر پٹختے ہوئے باہر چلے گئے۔

سردار بلدیو سنگھ سکھوں کے لیڈر ہونے کے علاوہ وزیر دفاع بھی تھے، اس لئے انہوں نے اپنی تقریر میں رُوئے سخن انہی کی طرف رکھا اور زیادہ تر افواج کو ہی اپنے ڈھب کی "تلقین" فرماتے رہے۔ ہندوستان کی تقسیم کو انہوں نے کچھ زیادہ پسند نہیں کیا تو برا بھی نہ کہا۔ اپنی تقریر ختم کرنے کے بعد، ہنستے مسکراتے ٹھنڈے ٹھنڈے براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے رخصت ہو گئے۔ ان کی تقریر کا ہندوستانی ترجمہ نشر کیا جانا طے شدہ پروگرام میں شامل نہیں تھا۔

ادھر نیوز کے سٹوڈیوز کی طرف سے سردار ولبھ بھائی پٹیل (وزیرِ اطلاعات و نشریات) "چودھری! چودھری!!" چلاتے ہوئے اسی گیلری میں داخل ہوئے جہاں چودھری (کنٹرولر) اپنا منہ بسورے حواس باختہ کھڑے تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل نے آتے ہی انگریزی میں گرج کر کہا: وائسرائے اس بات پر ناراض ہیں کہ "ٹرانسفر آف پاور پلان" کا ہندوستانی ترجمہ کیوں نشر نہیں کیا گیا حالانکہ ہندوستان کی جنتا کو اس کی تفصیل بتانا بے حد ضروری تھا؟

چوہدری نے عذر کرنا چاہا کہ پلان (منصوبہ) تو "ٹاپ سیکرٹ" تھا۔ اس کا پہلے سے ترجمہ کیسے تیار کیا جا سکتا تھا؟

لیکن سردار پٹیل نے ترش کر کہا: "اب تو یہ پلان نشر کیا جا چکا ہے۔"

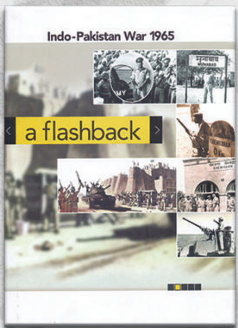
چودھری نے افسردہ انداز میں کہا: ''بہتر ہے۔ کل اس کا ترجمہ نشر کر دیا جائے گا۔''

سردار پٹیل پھر گرجے ''نو۔ نو، کل تو اخبارات میں شائع ہو جائے گا۔ تم سمجھتے کیوں نہیں! آج ریڈیو سے نشر ہوا ہے اس لئے اخبارات میں شائع ہونے سے پہلے اس کا ترجمہ بھی آج ہی ریڈیو سے نشر کیا جانا چاہیے۔ وائسرائے کی تقریر، منتقلی اختیارات کا پلان اور سب لیڈروں کی تقریروں کے ہندوستانی ترجمے فوری طور پر تیار کرا کر، آج ہی کی ٹرانسمشن ختم ہونے سے پہلے، آج ہی نشر کرائے جائیں!''

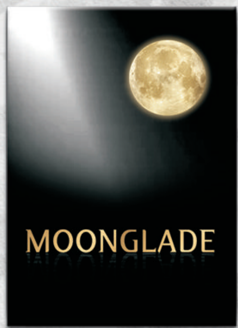
یہ حکم صادر فرما کر سردار پٹیل، وائسرائے کو یہ خوش خبری سنانے کے لئے پھر نیوز سٹوڈیو کی طرف چلے گئے۔ چوہدری (کنٹرولر) کے لئے وزیر نشریات کے نادر شاہی حکم کی تعمیل کرانے کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے حسب عادت پھر ایک ہنگامی میٹنگ منعقد کر ڈالی اور رشید احمد صاحب سٹیشن ڈائریکٹر سے مشورے کرنے لگے۔ ''جڑی بوٹی'' (شری نگیندر ناگائچ) نے وائسرائے کی تقریر اور پلان کا ترجمہ کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرنی چاہیں، لیکن چودھری نے اسے ڈانٹ دیا اور رشید احمد صاحب سے فرمایا کہ یہ اہم کام ناصری صاحب ہی کے سپرد کیا جائے۔ اس نے مسٹر جناح کی تقریر کا بہت اچھا ترجمہ کیا، چنانچہ ''قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند'' ۔ ''جڑی بوٹی'' کی پراچین زمانے کی مردہ سنسکرت آمیز ہندی کے مقابلے میں پھر اپنی زندہ و تابندہ شگفتہ اردو کو مزید فضیلت حاصل ہو گئی!

*****

ہماری دیگر مطبوعات



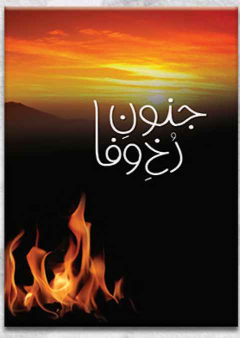


















ہلال
پبلیکیشنز
انٹر سروسز پبلک ریلیشنز
ہلال روڈ راولپنڈی کینٹ، فون: 051-9271617
ای میل: publications@hilal.gov.pk
www.ispr.gov.pk